میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ

چند الزامات کا تحقیقی جائزہ

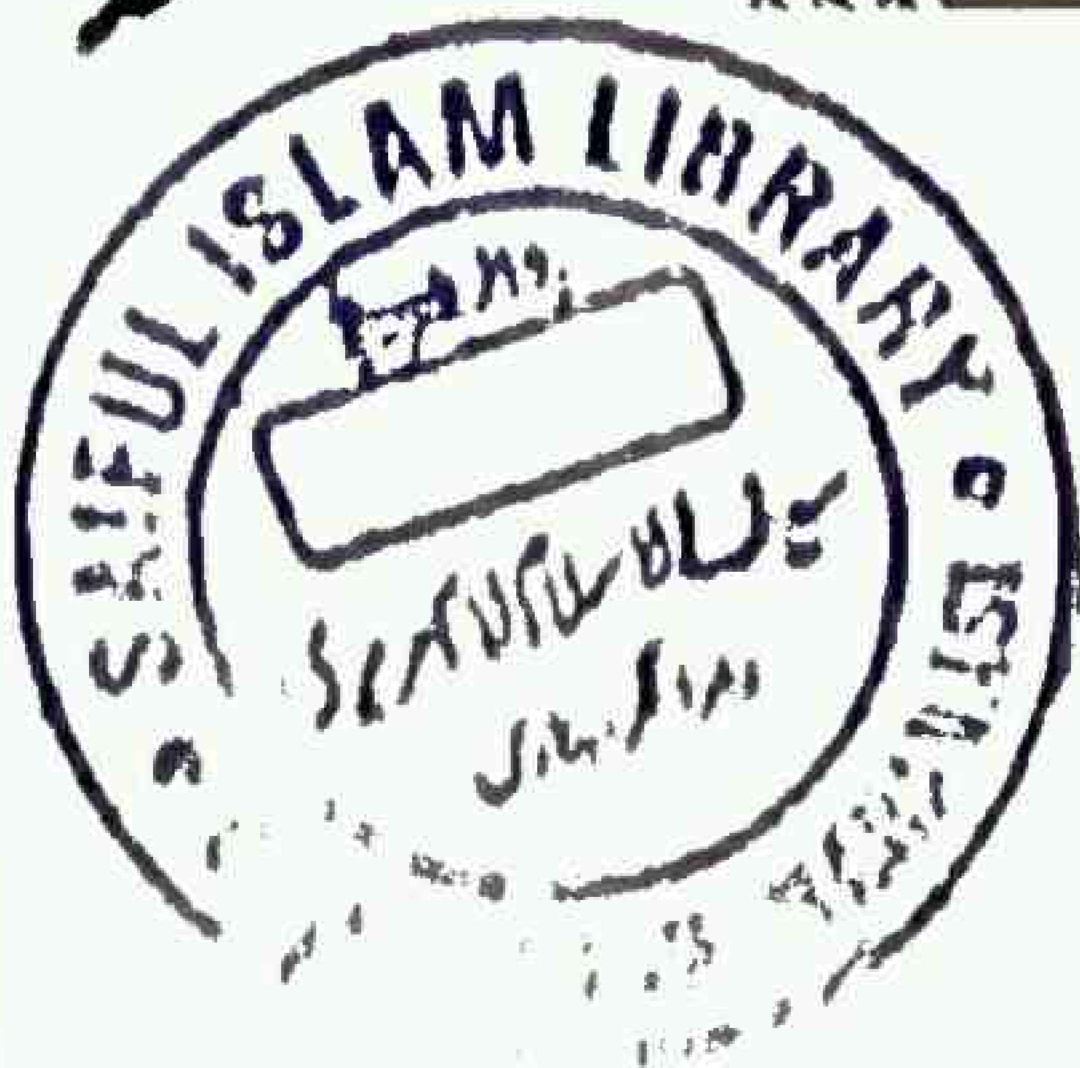
مولانا رفیع احمد مدنی

ناشر
فارغین جامعہ سلفیہ
مرکزی دارالعلوم بنارس
۲۰۱۶ء - ۱۴۳۷ھ

میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ

چند الزامات کا تحقیقی جائزہ

مولانا رفیع احمد مدنی





فارغین جامعہ سلفیہ
مرکزی دارالعلوم بنارس ۲۰۱۶ء—۱۴۳۷ھ

نام کتاب : میاں نذیر حسین محدث دہلوی: چند الزامات کا تحقیقی جائزہ

تالیف : مولانا رفیع احمد مدنی

ناشر : فارغین جامعہ سلفیہ مرکزی دارالعلوم بنارس ۲۰۱۶ء-۱۴۳۷ھ

سال اشاعت : مئی ۲۰۱۶ء

صفحات : 120

ملنے کے پتے

مکتبۃ الفہیم ریحان مارکیٹ، ڈھوبیا اِملی روڈ، صدر چوک مئوناتھ بھنجن

مکتبہ سلفیہ جامعہ سلفیہ ریوڑی تالاب وارانسی۔

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

برصغیر ہندو پاک میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ کی انقلابی تحریک کو آگے بڑھانے میں شیخ الکل فی الکل حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی علیہ الرحمہ کا کلیدی رول رہا ہے۔ شاہ اسحاق محدث دہلوی کے مکہ ہجرت کے بعد میاں صاحب ان کی مسند تدریس پر فروکش ہوئے اور سرزمین دہلی سے کتاب وسنت کا غلغلہ بلند کیا جس کی بازگشت ملک و بیرون ملک میں واضح طور پر سنائی دی۔ میاں صاحب کی اس درس گاہ سے باکمال علما اور باوقار فضلا کی ایک مقدس جماعت نکلی جس نے ہندوستان میں علم قرآن وحدیث کی ترویج و اشاعت کو اپنا وظیفہ حیات بنالیا اور تقلیدی جمود کو فرو کرنے اور ولی اللہی فکر کو پروان چڑھانے میں بڑی محنت و جانفشانی کا مظاہرہ کیا۔ حضرت میاں صاحب کے ارشد تلامذہ کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اس کے ذکر کے لیے ایک رجسٹر درکار ہے۔

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

برا ہو اس مسلکی تعصب اور بغض و عناد کا جس نے انیسوی صدی کے اس مرد مجاہد کی خدمات پر پردہ ڈالنے اور اس پر طعن زنی کرنے میں تمام اخلاقی حدود کو پامال کر دیا۔ وہ شخص جو تحریک آزادی فکر کا نقیب، شاہ ولی اللہ کے نظریات کا امین، جماعت سلف کا پاسبان ونگہبان، کتاب وسنت کا داعی، حضرت شاہ اسحاق کا شاگرد خاص.... تھا، امت کے ایک طبقے کی نگاہ میں معتوب ومغضوب ٹھہرا، اس پر دنیا جہان کے الزامات عائد کر کے اس کی تابناک شخصیت کو مسخ کرنے کی ناپاک کوششیں کی گئیں۔ آپ کا ''جرم'' صرف اتنا تھا کہ آپ تقلید کے بجائے عمل بالحدیث کے قائل تھے اور کتاب وسنت ہی کو اصل مرجع ومنبع قرار دیتے تھے۔

اصل دیں آمد کلام اللہ معظم داشتن
پس حدیث مصطفی بر جاں مسلم داشتن

زیر نظر کتاب میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کی سوانح، شاہ اسحاق سے تلمذ اور آپ کے حکومت انگلشیہ کے متعلق رویہ پر مشتمل ہے۔ یہ رسالہ درحقیقت ایک مفصل مقالہ ہے جو ماہنامہ محدث بنارس کے اکتوبر ۱۹۸۵ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ مدیر مجلّہ مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری صاحب نے اس کی افادیت کے پیش نظر محدث کے شمارے کو اس رسالے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ مذکورہ مقالہ بعض غلط فہمیوں کے سبب مولانا اقبال احمد سلفی کے نام سے مجلّہ میں شائع ہوا تھا تاہم تحقیق حال اور بعض اساتذہ کی رہنمائیوں کے بعد اصل مصنف کی بازیافت ہوئی۔ مؤلف مولانا رفیع احمد مدنی نیز مولانا اقبال احمد سلفی صاحبان سے استفسار کے بعد یہ عقدہ حل ہوا اور دونوں حضرات نے مؤلف کی طرف صحیح نسبت فرمائی۔ اس لیے محدث کے اس شمارے کو لے کر کسی قسم کی غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔

جامعہ سلفیہ مرکزی دارالعلوم بنارس کے فضیلت سال آخر کے طلبہ یادگار کے طور پر ہر سال کسی کتاب کی اشاعت کا اہتمام کرتے ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہے جو امسال (2016ء) کے فارغین کی جانب سے پیش خدمت ہے۔ بایں موقع ہم استاذ گرامی مولانا اسعد اعظمی صاحب (مدیر مجلّہ صوت الامہ) کے ممنون و مشکور ہیں جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ علاوہ ازیں ہم استاد گرامی مولانا محمد مستقیم سلفی اور مولانا محمد ابوالقاسم فاروقی صاحبان کے بھی شکر گذار ہیں جنہوں نے کتاب کے اصل مصنف کی طرف رہنمائی فرمائی۔ فاروقی صاحب اس لحاظ سے خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں کہ آپ نے اس کتاب کے اول حصہ (میاں صاحب کی سوانح) پر نظر ثانی کی اور ہماری و مؤلف کی فرمائش پر اس کا مراجعہ کیا نیز اپنے تاثراتی کلمات کے ذریعہ کتاب کو زینت بخشی۔ کتاب کے مؤلف نامور محقق محترم مولانا رفیع احمد مدنی حفظہ اللہ کے حضور گلہائے تشکر پیش کرتے ہیں کہ آپ نے اس کتاب کی اشاعت میں نہ صرف بھرپور معاونت فرمائی بلکہ ہماری درخواست پر حضرت میاں صاحب کی سوانح بھی مرتب

فرمائی۔ حالاں کہ آپ بہت ہی مصروف ترین شخص ہیں پھر بھی اس کام کے لیے اپنے قیمتی اوقات سے کچھ حصہ ہمارے لیے نکال ہی لیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میاں صاحب کی زیر نظر سوانح عمری حالت سفر میں سرزمین حرمین شریفین میں لکھی گئی ہے۔ شاید اسی کی برکت ہے کہ یہ چیز اب تک میاں صاحب کی سوانح پر لکھی گئی تمام تحریروں سے ہٹ کر اور تحقیقی انداز سے ایک نئے اسلوب میں لکھی گئی ہے جو کچھ غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کر رہی ہے اور چند نئے حقائق کو بھی اجاگر کر رہی ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے مؤلف کی باریک بینی اور ژرف نگاہی کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اللہ رب العالمین ان مخلصین کی تمام خدمات کو شرف قبولیت عطا فرمائے، دونوں جہان میں اس کا بہترین اجر عطا فرمائے اور صحت وعافیت کے ساتھ ان بزرگوں کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے۔ مادر علمی جامعہ سلفیہ بنارس کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور اسے ہر قسم کی بلاؤں اور آفتوں سے محفوظ رکھے۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو عوام وخواص کے حق میں مفید بنائے۔

این دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

از

فارغین جامعہ سلفیہ

مرکزی دارالعلوم، بنارس (۲۰۱۶ء)

۱۹/۴/۲۰۱۶ء

تقریظ

از قلم: مولانا محمد ابوالقاسم فاروقی
مدیر مجلہ محدث واستاذ جامعہ سلفیہ، بنارس

ہم نے تعلیمی اور تدریسی دونوں دور میں دیکھا کہ طلبہ کے لیے سب سے کٹھن لمحے وہ ہوتے ہیں جب وہ سند فراغت حاصل کر کے اپنے مادر علمی سے جدا ہوتے ہیں۔ مسرت اور غم کے ملے جلے جذبات واحساسات ناقابل اظہار ہوتے ہیں، خوشی اس بات کی ہوتی ہے کہ وہ اپنا تعلیمی مرحلہ تکمیل کر کے ایک نئی دنیا میں قدم رکھنے جارہے ہیں، غم یہ ہوتا ہے کہ وہ چمن ان سے چھوٹ رہا ہے جس میں انہوں نے ایک طویل عرصہ گذارا ہے، جس کے پھولوں سے اپنے دامن کو بھرا ہوا ہے، خوشبوؤں سے مشام جاں معطر کیا ہے۔ طالب علمی کا یہ دور پوری زندگی کا سب سے سنہری دور ہوتا ہے، نہ مسائل ہوتے ہیں، نہ ذمہ داریاں ہوتی ہیں، کلاس، محفلیں، انجمنیں، مطالعہ، آگے بڑھنے کا جذبہ، تحریر، تقریر اور تعلیم کے میدان میں منافست اور مقابلہ آرائی، ہدف پالینے کی لگن اور آرزو، یہی زندگی، یہی علمی فضا طالب علم کی زندگی کا سرمایۂ حیات ہوتا ہے، یہی اس کی کل کائنات ہوتی ہے۔ جب وہ یہاں سے جانے لگتا ہے تو اس کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کی حسین یادوں کو دیدۂ دل کا آئینہ بنالے اور ایک ایک نقش کو ستارہ بنا کر پلکوں میں سجالے۔

ہمارے جامعہ کے فضیلت ثالث کے طلبہ نے وداعی لمحات کو جاوداں اور کیف آگیں بنانے کے لیے کوئی اور ہی طرز جنوں ایجاد کیا ہے۔ وہ اپنے اس تربیت کدہ سے ایک شمع فروزاں اپنے ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ یہ ان کے لیے یادوں کی حسین سوغات بھی ہوتی ہے اور شب دیجور میں مشعل راہ بھی۔ یہ ان کے علمی ذوق کا عکاس بھی ہوتی ہے اور منہج سلف کا ترجمان بھی، اپنے مادر علمی سے محبت کا اظہار بھی اور نئی راہوں میں شریک سفر بھی

ہوتی ہے۔ سند فراغت حاصل کرنے والے یہ طلبہ کسی ایسی کتاب کی اشاعت کا انتظام کرتے ہیں جو ان کی کردار سازی، تعمیر سیرت میں مد اور معاون ہوئی ہو نیز طلبہ اور عوام میں یکساں افادیت کی حامل ہو۔

امسال فضیلت سال آخر کے طلبہ نے اشاعت کے لیے ایک ایسی کتاب کا انتخاب کیا جو ماہنامہ محدث کے خاص نمبر کی شکل میں آج سے بتیس سال قبل شائع ہو کر علمی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکی ہے۔ کتاب ایک تحقیقی دستاویز ہے، اس کا موضوع شیخ الکل فی الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کی ذات گرامی سے متعلق ہے، دوبارہ اس کی اشاعت وقت کا اہم تقاضا ہے۔

اس مقام پر میں ماضی کے دریچوں کو کھولنا چاہتا ہوں تاکہ اس کی روشنی میں آپ موضوع کی اہمیت کا اندازہ لگا سکیں۔ آج ہندوستان میں قال اللہ وقال الرسول کی جو جاں افزا صدائیں گونج رہی ہیں، مدارس کی ہمہ ہمی، توحید کے چرچے، سلفیت اور اہل حدیثیت کی جو ضیا پاشیاں نگاہوں کو خیرہ کر رہی ہیں اسی عظیم شخصیت کا عکس جمیل ہیں جنہیں ہم میاں صاحب محدث دہلوی کہتے ہیں۔ برصغیر میں اہل حدیثیت کی نشاۃ ثانیہ آپ کے دم سے ہوئی، تقلیدیت اور تصوف کے طلسماتی فریب کا پردہ چاک کرنے والے بھی آپ ہی تھے، ہندوستان کے مسلمان کتاب وسنت کی برکتوں سے محروم تھے، آپ نے اس کے سوتے کو جاری کر دیا، آپ کے بارے میں اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ ''نذیریات'' مستقل ایک موضوع بن چکا ہے۔ آپ ایک سید زادے تھے مگر عالی نسبی کا سہارا لے کر پیری مریدی کی دکان نہیں سجائی، درویشی اور قلندری رگ وریشے میں سرایت تھی، مگر کوئی خانقاہ، تکیہ اور دائرہ بنا کر جذب ووجد کی کیفیت میں نہیں ڈوب گئے، آپ نے ہواؤں کے رخ پر بہنا گوارہ نہ کیا، اللہ کی مشیت تو آپ سے کچھ اور کام لینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ آپ نے دلی کی گنجان آبادی میں شریعت مطہرہ کا ایک مرکز قائم کیا، درس وتدریس کی بنا ڈال دی، جس کے فیضان نے ملک وبیرون ملک کا احاطہ کر لیا۔

دعوت وعزیمت کی راہ میں بلاؤں کا آنا لازمی ہے۔ آپ تو نبوت ورسالت کے سچے جانشین اور شریعت مطہرہ کے امین تھے، سیرت نبوی کے مشعل بردار تھے۔ جو رہبران ملت کا تمغہ لگا کر اپنی دکان چلا رہے تھے، آپ کے دشمن بن گئے۔ تقلیدیت کے ستون لرزنے لگے تو نام نہاد پیشواؤں کی جبینیں عرق آلودہ ہونے لگیں، قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا کی جانے لگیں، الزامات، اتہامات، کردار کشی، وطن سے غداری، انگریزوں سے وفاداری، تکفیر وتفسیق، کے فتاووں کی یورشیں ہونے لگی، مگر یہ بوریہ نشین کو وہ گراں ثابت ہوا

کسے خبر تھی کہ لے کر چراغ مصطفوی
جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بولہبی

کوشش یہ تھی کہ کس طرح اس عظیم شخصیت کی شبیہ کو داغ دار کر دیا جائے، اس کے منصب ومقام کو مشکوک کر دیا جائے تاکہ ظنون واوہام کی وادیاں سرسبز وشاداب رہیں اور قیادت وسیادت کی لگام ان کے ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ آپ کے شاگردوں نے تحمل، رواداری اور صبر کا دامن کبھی نہ چھوڑا، خود آپ نے ہر سب وشتم کا استقبال مسکراہٹ کے ساتھ کیا، اہل حدیث عالم جارح نہیں ہوتا ہے مگر وہ جارحیت کا جواب دلائل، براہین، تحقیق اور تدقیق سے دینا خوب جانتا ہے۔ جھوٹ پر جھوٹ بولے جائیں اور تاریخ میں خیانت کی جائے تو حقائق کا انکشاف ضروری ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے میاں صاحب کی شاہ محمد اسحاق مہاجر مکی کی شاگردی کے مسئلہ کو معرکہ کارزار بنایا گیا۔ ایک صاحب قاری عبدالرحمٰن پانی پتی نے ''کشف الحجاب'' نامی کتاب ہی لکھ ڈالی اور من گھڑت روایات کا طومار لگا دیا جس کا جواب مولانا محمد سعید صاحب محدث بنارسی نے ''هداية المرتاب برد ما في كشف الحجاب'' کے نام سے دندان شکن جواب دیا لیکن دیوبندی مکتبۂ فکر نے باقاعدہ محاذ بنا لیا جو آج تک جاری ہے۔ اتحاد واتفاق کا نعرہ لگانے والے، ایک ہو جائیں تو بن سکتے ہیں خورشید مبیں کی دعوت دینے والے، تحفظ شریعت کی دہائی دینے والے، جبہ ودستار، تقدس اور عزت مآبی کی آڑ میں کیا کیا گل کھلاتے ہیں اور تاریخ سازی کی کس طرح

کوششیں کرتے ہیں اس کا اندازہ ان کی کتابوں کو پڑھ کر بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

زیر نظر کتاب بھی میاں صاحب سے متعلق چند گھناؤنے الزامات کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ ہے۔ آج بھی ایک گروہ مسلسل چبائے ہوئے لقمے کو چبا رہا ہے، جھوٹی اور من گھڑت روایات کی تکرار پر تلا ہوا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ دفاع عن السنت سے متعلق اسلاف کی کتابوں کی بار بار اشاعت کی جائے اور ان موضوعات پر لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے، یہ تحفظ سنت کا فریضہ ہے۔ اس سے اغماض برتنا دین میں مداہنت ہے۔ مقالہ کے مرتب جامعہ سلفیہ کے فاضل شیخ رفیع احمد مدنی (مقیم حال سڈنی آسٹریلیا) ہیں۔ فضیلت ثالث کے طلبہ نے اس کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب انہیں جامعہ کے نصب العین اور اہداف و مقاصد کی ہمیشہ یاد دلاتی رہے گی ۔ اللہ رب العالمین کے حضور دعا گو ہوں کہ اے اللہ! تو ہمارے ایمان اور عقیدے کی حفاظت فرما، ہمارے یہ بچے جو عملی دنیا میں قدم رکھ رہے ہیں، انہیں دین کا سچا خادم، داعی اور عالم باعمل بنا، تو ان کی دینی خدمات کو ہمارے لیے صدقہ جاریہ بنا۔ ربنا آتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة وقنا عذاب النار۔

محمد ابوالقاسم فاروقی

گزارش احوال واقعی

میں نے ۱۹۷۶ء میں ایک مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون میاں نذیر حسین محدث دہلوی (۱۸۰۵-۱۹۰۲ء مطابق ۱۲۲۰-۱۳۲۰ھ) کے بارے میں تھا۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء میں اسی کو ماہنامہ محدث میں شائع کیا گیا۔ اشاعت کے سالوں بعد مجھے اس کی اطلاع ملی۔ مولانا صفی الرحمٰن صاحب مبارکپوری اس وقت محدث کے ایڈیٹر تھے۔ آپ نے نہ صرف یہ کہ محدث کا پورا شمارہ اس مضمون کے لیے وقف کردیا بلکہ مبالغہ آرائی کی حد تک اس کی تعریف کی۔ انہوں نے لکھا کہ: ''......مناسب معلوم ہوا کہ محدث کا موجودہ شمارہ اسی مقالہ کی نذر کردیا جائے۔ آپ بھی پڑھیے اور حقائق کے علم کے ساتھ ساتھ طلبہ کی تحقیق وتدقیق کا بھی اندازہ لگایئے۔'' اس جملہ نے مجھے خوشگوار حیرت میں مبتلا کردیا۔ یہ ایک طالب علمانہ کوشش تھی۔ میں نے پھر کبھی اس کو پڑھا نہ اس میں کوئی حک واضافہ کیا، لیکن مضمون کمپوز کرنے کے بعد عزیزم طارق اسعد نے اصرار کیا کہ میں پورا مضمون ایک بار ضرور پڑھ لوں۔ ان کے محبت بھرے اصرار سے مجبور ہوکر مجھے یہ مضمون پڑھنا پڑا جس کے نتیجے میں کتابت کی غلطیوں کی اصلاح کے ساتھ کسی کسی جگہ زبان وبیان میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ان معمولی تبدیلیوں کے علاوہ مضمون اپنی اصل شکل میں شائع ہورہا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جامعہ سلفیہ میں فضیلت کے آخری سال کے طلبہ کوئی کتاب یادگار کے طور پر شائع کرتے ہیں۔ اس سال کے طلبہ نے اسی مضمون کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے اس فیصلے سے مجھے حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ اتفاقاً میں جامعہ سلفیہ آیا، ملاقات ہوئی تو ازراہ کرم یہ حکم ہوا کہ میاں صاحب کی زندگی پر ایک مضمون فراہم کیا جائے تاکہ وہ بھی شامل اشاعت ہوسکے۔ ان کی محبت کے سامنے میں انکار نہ کرسکا۔ مسلسل سفر میں ہونے کے باوجود حکم کی تعمیل کردی۔ کاش کہ یہ مضمون اور اطمینان سے کسی ایسی جگہ رہ کر لکھا جاتا جہاں سارے مراجع بآسانی دستیاب

ہوتے۔ بہر حال یہ ''جہد مقل'' پیش خدمت ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ پورا مضمون مکہ اور مدینہ میں لکھا گیا۔ یہ سطریں بھی مدینہ میں لکھی جارہی ہیں۔



میرا کافی دنوں سے خیال تھا کہ اس مضمون کو از سر نو لکھوں، اور وہ سب مواد بھی سمیٹ لوں جو چالیس سال میں نظر سے گزرا ہے۔ جس وقت یہ مضمون لکھا گیا تھا اہل حدیث اور سیاست اور ابوالکلام کی کہانی کے علاوہ اور کوئی خاص چیز نہیں مل سکی تھی جس سے رہنمائی لی جاسکے۔ اب صورت حال مختلف ہے۔ تحریک شہیدین سے متعلق بہت سارا مواد دستیاب ہے، قیام الدین احمد کی کتاب انگلش اور اردو میں شائع ہوکر مقبول عام ہوچکی ہے، احسن ڈیانوی اور تنزیل صدیقی کی کتاب منظر عام پر آئی ہے، اس کا تیسرا ایڈیشن ''برصغیر ہندو پاک چند حقائق'' بڑا وقیع ہے، ڈاکٹر بہاء الدین نے قابل قدر کام کیا ہے۔ میری طالب علمانہ کوشش اس کے مقابل میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ مجھے ہمیشہ اس کا احساس رہا ہے کہ مزید کام کی ضرورت ہے۔ اسی لیے برابر مواد جمع کرتا رہا۔ علمائے احناف جن کتابوں کو اس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں ان بنیادی کتابوں کو تلاش کیا۔ گلشن آبادی کی جامع الفتاوی، نواب قطب الدین کی تحفۃ العرب والعجم، منصور علی کی فتح المبین فی تنبیہ الوہابیین، بدنام زمانہ ''تنبیہ الضالین''، اور قاری عبدالرحمٰن پانی پتی کی ''کشف الحجاب'' بتقدیم حکیم محمود احمد برکاتی وغیرہ تک رسائی ہوئی۔ ادھر احناف کے بعض دوسرے گرگے بھی کیل کانٹے سے لیس ہوکر میدان میں آگئے ہیں۔ حکیم محمود احمد برکاتی نے اپنی متعدد تحریروں میں اچھا خاصا معاندانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ اسی طرح پاکستان سے الیاس گھمن نے ایک انتہائی دل آزار کتاب شائع کر کے احناف کی ہمدردی اور چندہ حاصل کرنا چاہا ہے۔ گھمن صاحب کی زبان بھی گندی ہے اور علم بھی سطحی ہے لیکن اندھوں میں کانا راجہ کی مثال صحیح ہے۔ ان کے چیلے انہیں حکیم الاسلام کے لقب سے متعارف کرا رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان سب کا بھی جائزہ لیا جائے۔ ان شاء اللہ جلد ہی یہ کام بھی شروع کرنے کا ارادہ ہے، وباللہ التوفیق۔ میاں صاحب کی زندگی پر لکھا گیا مقالہ بھی مکمل نہیں لیکن جو کچھ ہوسکا پیش کردیا۔ میں میاں صاحب کی خانگی زندگی اور پورے خاندان سے ان کے روابط کو اور وسیع پیمانے پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے مکاتیب

میں اچھا خاصہ مواد موجود ہے۔ طوالت کے سبب اس کو کسی دوسرے وقت کے لیے چھوڑ رکھا ہے۔ میں نے قصداً تصنیف وتالیف کو اس مضمون میں شامل نہیں کیا ہے، صرف فتاوی اور معیار کا ذکر استطراداً آ گیا ہے۔ یہی دونوں ان کی خاص تصنیفات میں شمار کی جاتی ہیں۔ اسی طرح مولانا شاہ اسحٰق کی جانشینی کے موضوع کو بھی نہیں چھیڑا ہے، میرا خیال تھا کہ شاگردی کے مسئلہ میں جو بحث ہے وہ کافی ہے۔ دہلی میں میاں صاحب کے سامنے نہ کسی کا چراغ جل سکتا تھا نہ جلا، اس لیے نہ بورڈ چلیں یگانہ بورڈ کے ممبران، نہ ہی پانی پتی جیسے خودساختہ جانشین کوئی کارنامہ انجام دے سکے۔ دیوبند اور بریلی حضرات کی ساری تگ ودو سلبی ہے۔ وہ میاں صاحب کا قد گھٹانا چاہتے ہیں تاکہ دونوں کو مقابلہ میں لایا جا سکے۔ حال ہی میں میں نے جب کشف الحجاب پڑھی تو میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔ واقعی پانی پتی صاحب نے سارے پاپڑ اسی لیے بیلے ہیں۔ آپ بھی پڑھیں ان شاء اللہ اسی نتیجے پر پہنچیں گے۔ لکھتے ہیں:

"پھر قطب صاحب میں سید نذیر حسین صاحب نے اپنے خسر کے پردے میں خلافت وجانشینی کی درخواست کی۔ جواب سخت سن کر ناامید ہوئے۔" (ص: ۳۱)

حاشیہ میں لکھتے ہیں: "تفصیل آچکی ہے کہ جب قطب صاحب میں جناب مولانا اسحٰق صاحب نے ہجرت کے وقت چار روز موقف کیا، رؤسائے دہلی بھی بطور رخصت کے آئے۔ مجمع رئیسوں میں مولوی نذیر حسین صاحب نے جناب سے عرض کیا: "آپ دہلی کو علم سے خالی کیے جاتے ہیں۔ کسی کو اپنی جگہ اپنا جانشین فرمادیویں۔ اپنے شاگردوں خاص (کذا) جیسے مولوی عبد الخالق جو آپ کو قدیم شاگرد ہیں۔" اور مولوی عبد الخالق بھی موجود تھے۔ سمجھا ہوگا مولوی صاحب تو ضعیف ہیں، مجھے بھی خلیفہ فرمادیویں۔ مولوی صاحب نے غصہ سے فرمایا: "کونسی خدمت بادشاہی میں رکھتا تھا جو اپنا جانشین کر جاؤں۔" سید نذیر صاحب خاموش ہو رہے، دوسرے دن پھر اسی مجمع میں عرض کیا: آپ کے بعد ہم کس سے پڑھا کریں؟ فرمایا جو لائق ہوگا وہ پڑھائے گا۔ پھر رئیس دہلی بھی سید نذیر حسین سے معین ہوئے اور عرض کیا اگر ہم کو آپ کے بعد کچھ شک ہوا کرے تو کس سے پوچھا کریں تو فرمایا قطب الدین خان اور عبد الرحمٰن کو حدیث پڑھادی ہے۔ اگر حاجت ہو ان سے پوچھ لینا۔ جب سید نذیر نے جواب نامرادی کا سنا، ناامید ہو کر چپ

ہو رہے۔'' میں نے قصداً یہ طویل اقتباس نقل کیا ہے کیونکہ یہ بذات خود قاری صاحب کے دعویٰ عدم شاگردی کو جھٹلاتا ہے۔ کیا میاں صاحب یا کوئی بھی اتنا سادہ لوح ہوگا کہ بلا شاگردی اور باقاعدہ استفادہ کے خلافت اور جانشینی کی توقع کر بیٹھے؟ یہ قول ہی شاگردی ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ شاہ اسحٰق کا کہنا کہ جو باصلاحیت ہوگا پڑھائے گا بھی اس بات پر دلیل ہے۔ اگر مان لیں کہ آخری وقت میں قطب اور پانی پتی کے بارے میں کہا کہ ان سے شکوک کا ازالہ کر لینا۔ تو یہ عوام کی بات تھی ان کو کہا جا رہا ہے کہ یہ دونوں اتنی ہی صلاحیت رکھتے ہیں کہ عوام کو مطمئن کر لیں۔

٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭

کتابیات میں صرف ان مراجع کو شامل کیا گیا ہے جو اصل پرانے مضمون میں استعمال ہوئی ہیں۔ میاں صاحب کی زندگی پر لکھے گئے اضافی مضمون میں جو کتابیں استعمال ہوئی ہیں ان کی تفصیل سنہ طبع وغیرہ حاشیہ میں درج کر دی گئی ہے۔

رفیع احمد

مقیم سڈنی، آسٹریلیا۔

فصل اول

میاں نذیر حسین محدث دہلوی

(۱۲۲۰ھ-۱۳۲۰ھ، ۱۸۰۵ء-۱۹۰۲ء)

میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام آج بھی مانوس سا لگتا ہے، حالانکہ ان کی وفات پر ۱۱۴ سال کی مدت گذر چکی ہے۔ ''میاں صاحب'' کے نام سے معروف بوریہ نشین شخصیت کا شہرہ اس کی زندگی ہی میں متحدہ ہندوستان کی حدود سے باہر تک پھیل چکا تھا۔ میاں صاحب کی ذات نہ اس وقت محتاج تعارف تھی اور نہ آج ہے، ان کے بارے میں کچھ لکھ کر ہم اپنا ہی قد بڑا کرنا چاہتے ہیں۔

سن پیدائش:

آپ کے سن پیدائش کے بارے میں کئی اقوال منقول ہیں، صحیح تاریخ پیدائش ۱۲۲۰ھ مطابق ۱۸۰۵ء ہے۔(۱)

آپ کے سن پیدائش کے بارے میں دوسرے اقوال یہ ہیں ۱۲۱۱ھ، ۱۲۱۲ھ، اور ۱۲۱۶ھ۔(۲)

صاحب نزہۃ الخواطر نے ''قیل'' کے ساتھ ۱۲۲۵ھ کا تذکرہ کیا ہے۔(۳) مولانا ڈیانوی نے غایۃ المقصود میں ۱۲۲۵ھ کو جزماً ذکر کیا ہے۔(۴) تاہم عون المعبود میں بصراحت

---

(۱) الحیاۃ بعد المماۃ کے مؤلف نے اس تاریخ کو متعدد وجوہ سے ترجیح دی ہے، دیکھیے ص: ۲۵ (طبع الکتاب انٹرنیشنل دہلی) مولانا ڈیانوی نے عون المعبود میں ایک خاندانی نوشتہ کی بنیاد پر اس کو اختیار کیا ہے۔ (عون المعبود: ۱/ ۵) صاحب نزہۃ نے بھی اسی کو ترجیحاً ذکر کیا (نزہۃ الخواطر: ۷/ ۱۳۹۱، طبع بیروت) مولانا سیالکوٹی نے بھی یہی تاریخ ذکر کی ہے، دیکھیے: تاریخ اہل حدیث ص: ۴۳۵۔

(۲) الحیاۃ بعد المماۃ: ص ۲۵۔

(۳) نزہۃ الخواطر ۷/ ۱۳۹۱۔ (طبع ابن حزم)

(۴) غایۃ المقصود: ۱/ ۵۱، انہیں کی اتباع میں صاحب البشری بسعادۃ الدارین نے یہی قول ذکر کیا ہے۔ ص: ۲، طبع جمعیۃ التوحید کشن گنج، الہند۔

رجوع کرلیا ہے۔[1]

دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا نوشہروی نے سن پیدائش کا ذکر ہی نہیں کیا۔

جائے پیدائش:

میاں صاحب کا تعلق صوبہ بہار سے ہے جو بہت سے باکمال اہل علم کا منبع ہے۔ صوبہ بہار کا ضلع مونگیر بہت مشہور ہے۔ اسی ضلع میں سورج گڑھ کا قصبہ واقع ہے۔ میاں صاحب کی پیدائش اسی قصبہ کے ایک مضافاتی گاؤں میں ہوئی۔ اس کا نام ''بلتھوا'' ہے جہاں آپ کے والد کا قیام تھا۔[2] سورج گڑھ چوں کہ معروف جگہ تھی اس لیے اکثر تذکرہ نگاروں نے اسی کو آپ کی جائے پیدائش قرار دیا ہے۔[3] ''بہاری'' اور ''سورج گڑھی'' کی نسبت وطن کی مناسبت سے ہے۔

نام ونسب:

آپ کا نام سید نذیر حسین بن سید جواد علی تھا۔ آپ کا تعلق سادات کے گھرانہ سے ہے۔ ددھیال اور ننھیال دونوں نسبتوں سے حسینی سید ہیں۔ اسی نسبت سے اپنے آپ کو ''حسینی'' اور ''سید'' لکھتے تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ ''میاں صاحب'' کا ٹائٹل بھی آپ کی اسی نسبت سے تعلق رکھتا ہے۔[4] یہ لقب آپ کے لیے کب استعمال ہوا معلوم نہیں ہے۔ قیاساً شاہ محمد اسحاق کی

---

(۱) عون المعبود: ۱/۵، لکھتے ہیں: "وإنما أرخت في غاية المقصود شرح سنن أبي داؤد سنة خمس وعشرين، لأن شيخنا العلامة لما سألته عن علم ولادته أجابني أني لم أحفظه بالتعيين، لكن أظن ولدت سنة خمس وعشرين أو قبل ذلك بقليل" صاحب نزہۃ الخواطر نے جو قول "قیل" کے ساتھ ذکر کیا ہے اس کا ماخذ بھی غالباً صاحب غایۃ المقصود ہی کی تحریر ہے۔

(۲) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۲۲، تراجم علمائے حدیث ہند، ص: ۱۳۹، دبستان حدیث، ص: ۲۷، حیات شمس الحق مؤلفہ عزیر شمس، ص: ۲۶۷۔ بلتھوا سورج گڑھ سے پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

(۳) غایۃ المقصود: ۱/۵۱، عون المعبود: ۱/۵، واقعات دارالحکومت: ۲/۲۶۹، نزہۃ الخواطر: ۷/۱۳۹۱ (طبع ابن حزم، بیروت) گاؤں کا نام سروج گڈھا طبع ہوا ہے، البشری بسعادۃ الدارین، ص: ۲۷، تاریخ اہل حدیث، ص: ۴۲۵، علمائے ہند، مترجمہ ایوب قادری، ص: ۵۹۵، مدارس اہل حدیث دہلی، ص: ۳۸۱۔

(۴) الحیاۃ بعد المماۃ، ص ۲۱ "۔۔۔نہایت خوش ہوں کہ ہر ایک "میاں صاحب" مجھے کہتا ہے، بھائی سادات کے لیے پیار لفظ اس سے بڑھ کر نہیں ہے۔"

ہجرت کے بعد لوگ اس لقب سے مخاطب کرنے لگے۔

صاحب واقعات دارالحکومت کا کہنا ہے: ''سارے شہر میں اسی پیارے نام سے پکارے جاتے تھے۔''[1] صاحب الحیاۃ بعد المماۃ کا خیال ہے کہ آپ کو یہ لقب ''پبلک نے دیا اور پبلک نے پکارا۔''

میاں صاحب کا لقب بظاہر کوئی جاذبیت نہیں رکھتا تاہم کم از کم دہلی میں اس کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لقب صرف شاہ ولی اللہ کے خاندان کے لیے مختص تھا۔ حکیم محمود برکاتی کو ''میاں صاحب'' کے لقب سے بڑی تکلیف پہنچی۔ ان کے خیال میں: ''میاں نذیر حسین..خود کو میاں صاحب کہلانے لگے تھے۔''[2] یہ بات تو سمجھ سے بالاتر ہے کہ دہلی کے باہر کا شخص اپنی کوشش سے دہلی کے خاص لقب کو اپنا لے، یہ تو قبول عام تو محض عوامی رجحان سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ شاہ اسحاق صاحب کے ہجرت کے بعد عوام وخواص نے آپ کو اس لقب سے پکارا تو یقیناً یہ بات سامنے رہی ہوگی کہ فن حدیث میں شاہ صاحب کے بعد آپ کا ہی مرتبہ ہے۔ قاری عبدالرحمٰن پانی پتی کو شکایت ہے: ''بعد ہجرت جناب میاں صاحب کے جو دہلی خالی پائی آپ محدث بن بیٹھے۔''[3] اور ''باوجودیکہ....مخالف مذہب جناب میاں صاحب کے ہیں، اسی طرح عوام ان کو مقتدی اہل سنت جانتے ہیں۔''[4]

آپ کا پورا نسب نامہ 'غایۃ المقصود' میں اس طرح درج ہے:

"السيد محمد نذير حسين بن السيد جواد علي، بن السيد إله بخش،[5] بن السيد محمد بن السيد ماه رو، بن السيد محبوب، بن السيد قطب الدين، بن السيد هاشم، بن السيد جاند (چاند)، بن السيد معروف، بن السيد بدهن، بن السيد الحاج يونس، بن السيد بزرك (بزرگ)، بن السيد زيرك، بن السيد ركن الدين، بن السيد جمال الدين، بن السيد

---

(۱) واقعات دارالحکومت، ۲/۰ ۲۷۔ (۲) حکیم محمود برکاتی تقدمہ کشف الحجاب، ص: ۱۳۔

(۳) کشف الحجاب، ص: ۳۱۔ (۴) ایضا، ص: ۳۲۔

(۵) الحیاۃ بعد المماۃ میں جواد علی کے والد کی حیثیت سے سید عظمت اللہ کا ذکر ہے، ''الہ بخش'' کو ان کا دادا قرار دیا گیا ہے، ص: ۲۷۔ نزہۃ الخواطر (۷/۱۳۹۱) میں اسی طرح مذکور ہے، البتہ الہ بخش کے بجائے ''اللہ بخش'' درج ہے۔ البشری بسعادۃ الدارین میں شجرہ میں سید بدھن کے بعد کئی نسلیں چھوٹ گئیں ہیں، ص: ۲۶-۲۷۔ حسنی اور حسینی دونوں نسبتوں کا بھی ذکر ہے۔

أحمد،[1] بن السيد محمد، بن السيد محمود بن السيد داؤد، بن السيد فضل، بن السيد فضيل،[2] بن السيد أبوالفرج الإمام الحسن العسكري، بن السيد الإمام محمد تقي،[3] بن الإمام موسى الرضا، بن السيد الإمام موسى الكاظم، بن السيد الإمام جعفر الصادق، بن السيد الإمام محمد الباقر، بن السيد الإمام زين العابدين، بن الإمام الهمام حسين، بن الإمام خليفة رسول الله علي، بن أبي طالب، بن عبد المطلب، بن هاشم، بن عبد مناف–إلى إسماعيل بن إبراهيم صلوات الله عليهما والتسليم۔[4]

یہ نسب نامہ آپ کے والد کی طرف سے ہے، صاحب الحیاۃ بعد المماۃ نے والدہ کا شجرہ نسب بھی ذکر کیا ہے۔[5]

آپ کا گھرانہ سورج گڑھ اور اسی کے مضافات میں آباد تھا اور کافی معزز شمار کیا جاتا تھا۔ جب سید احمد شہید رحمہ اللہ حج کے لیے اپنے قافلہ کے ساتھ اس نواح سے گذرے تو اسی گھرانے نے آپ کی ضیافت کی۔ بعض تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ جاتے ہوئے پندرہ دن قیام رہا۔ حج سے واپسی پر بھی یہاں ٹھہرے۔ پورے قافلہ کی ضیافت کی ذمہ داری انہیں سورج گڑھ کے سادات پر تھی۔[6] اس بات سے ان حضرات کی دینی اور دنیاوی وجاہت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۳۰۰/افراد پر مشتمل قافلہ کی خورد ونوش کا انتظام کرنا متمول اور صاحب حیثیت گھرانہ ہی کے لیے ممکن ہوسکتا ہے۔

تعلیم وتربیت:

میاں صاحب کی ابتدائی تعلیم کی تفاصیل معلوم نہیں ہیں، تاہم جو باتیں معلوم ہیں ان

---

(۱) الحیاۃ بعد المماۃ، ص:۲۶-۲۷میں سید احمد کا ذکر نہیں ہے، بلکہ سید محمد کو ان کے والد کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔
(۲) الحیاۃ بعد المماۃ میں "افضل" کے نام کا ذکر ہے، ص:۲۶،۲۷۔
(۳) الحیاۃ بعد المماۃ میں امام محمد تقی کا ذکر حسن العسکری کے والد کی حیثیت سے کیا ہے، ص:۲۶۔
(۴) غایۃ المقصود:۱/۵۱۔ (۵) الحیاۃ بعد المماۃ، ص:۲۶،۲۷۔
(۶) الحیاۃ بعد المماۃ، ص:۳۶۔ کسی اور خارجی ماخذ سے اس کی تصدیق نہیں کرسکا، دو ہفتہ کا قیام بعید از قیاس لگتا ہے۔ سید جعفر نقوی نے اپنی کتاب "سید احمد شہید کا حج" اردو ترجمہ عبید اللہ السعدی میں سورج گڑھ کے قیام کا تذکرہ نہیں کیا ہے، علی میاں "سیرت سید احمد شہید" (۱/۳۰۷) میں صرف ایک رات ۲۷/محرم کے قیام کا ذکر کرتے ہیں۔ علی میاں نے واپسی پر مونگیر میں قیام کا ذکر کیا ہے، سورج گڑھ کا تذکرہ نہیں ہے۔ (۱/۳۶۹-۳۷۰) مولانا جعفر علی نے بھی واپسی میں صرف مونگیر میں قیام کا تذکرہ کیا ہے۔

سے بدلی جاسکتی ہے۔ آپ کے سوانح نگار عام طور سے یہ تاثر دیتے ہیں کہ آپ کا بچپن ۱۵-۱۶ سال کی عمر تک کھیل کود میں گذرا۔ پڑھائی کی طرف توجہ اس کے بعد میں ہوئی۔

صاحب الحیاۃ بعد المماۃ لکھتے ہیں:

''بچپن کے زمانہ کو کوئی واقعہ... قابل ذکر معلوم نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ کھیلنے کا شوق حد سے زیادہ تھا تیز دوڑنے، گھوڑا چڑھنے، میں مشاق تھے اور پڑھنے لکھنے سے سخت بدشوق۔ (۱)

صاحب تراجم علمائے حدیث ہند لکھتے ہیں:

''میاں صاحب کا عہد طفولت لہو ولعب میں گذرا۔ کبھی دریا میں شناوری کے جوہر دکھا رہے ہیں تو کبھی اسپ شہوار کی پشت پر شہسواری کے کرتب، مگر ابھی تک علم کا ایک قطرہ نے بھی دہن کو تر نہ کیا۔'' (۲)

ایوب قادری نے لکھا: ''۱۶ سال کے بعد علم کی طرف میلان ہوا'' (۳)

عزیر شمس کا خیال ہے: " ولم يرغب في القراء ة حتى دخل في السنة السادسة عشرة من عمره، فتعلم من أبيه الخط و قرأ بعض الكتب الفارسية والعربية "۔ (۴)

ان تصریحات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ میاں صاحب کی ابتدائی تعلیم کافی دیر سے شروع ہوئی۔ مجھے بوجوہ اس نتیجے کی صحت میں تامل ہے۔

زمانہ قدیم سے شریف گھرانے بچوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرتے تھے، میاں صاحب کا گھرانہ سادات کا معروف گھرانہ تھا، اس کی اپنی وجاہت تھی۔ اس لیے یہ تو ممکن نہیں کی ۴-۵ رسال کی عمر میں آپ کی تعلیم شروع نہ کی گئی ہو اور سولہ سال کی عمر تک آپ علم سے کورے رہے ہوں۔ عام رواج کے مطابق عربی اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم تو گھر یا گاؤں پر ہوتی تھی۔ یہیں ناظرہ قرآن مجید بھی پڑھایا جاتا تھا، کوئی وجہ نہیں کہ میاں صاحب اس کلیہ سے مستثنیٰ ہوں۔

---

(۱) الحیاۃ بعد المماۃ، ص:۳۲، مولانا بھٹی مرحوم نے دبستان حدیث ص:۲۸ میں اس کو اپنے الفاظ میں ڈھال دیا ہے۔

(۲) تراجم علمائے حدیث ہند، ص:۱۵۰۔ (۳) علمائے ہند، ص:۵۱۵۔

(۴) حياة المحدث شمس الحق وآثاره، ص:۲۶۷۔

مولانا ڈیانوی لکھتے ہیں: "نشأ بموطنه...وقرأ القرآن وكتب الإنشاء على معلمي بلده ونواحيها"(۱) یعنی اپنے وطن میں پلے بڑھے...قرآن پڑھا اور انشاء اپنے شہر اور نواحی کے معلمین سے سیکھا۔

یہی بات صاحب نزہۃ الخواطر نے اپنے الفاظ میں بیان کی ہے: "نشأ بها وتعلم الخط والإنشاء" (۲) یہیں نشو ونما ہوئی، لکھنا اور انشا پردازی سیکھی۔

میرا خیال ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم اور لکھنا پڑھنا تو آپ نے ابتدا میں سیکھا، پھر دس گیارہ سال کی عمر میں کھیل کود کی طرف رغبت ہوئی ہوگی اور علم کی طرف التفات کم ہوگیا۔ اس مرحلہ میں چند سال اسی طرح گذرے کہ ایک حادثہ کے نتیجہ میں دوبارہ علم کی طرف توجہ ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شناسا برہمن نے میاں صاحب سے کہا: "میاں! تم اتنے بڑے ہوگئے اور کچھ پڑھا نہیں، دیکھو تمہارے خاندان میں لوگ مولوی ہیں اور تم جاہل ہو۔"(۳)

اس کے بعد میاں صاحب کے علم کی طرف رغبت اور شدید اشتیاق کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔(۴)

اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ مطلقاً حصول علم کی ابتداء اس وقت ہوئی ہے، کیوں کہ اس واقعہ کے بعد فارسی کی تکمیل اور عربی کی ابتدائی کتب کا درس شروع ہوتا ہے۔ جس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ پہلے مرحلہ کی تعلیم مکمل ہوچکی تھی، معمولی لکھنا پڑھنا اور ناظرہ قرآن خوانی کی استعداد پیدا ہوچکی تھی۔ اس استعداد کے بغیر فارسی اور عربی پڑھنا ناممکن ہوگا۔

اس دوسرے تعلیمی مرحلہ کی ابتدا والد صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرکے کیا۔ بقول صاحب الحیاۃ بعد المماۃ: "آپ کے والد کو فارسی میں اچھی دستگاہ تھی، اس لیے فارسی انہوں نے پڑھائی اور جب فارسی کی درسی کتابیں نکل گئیں تو عربی کی ابتدائی کتاب بھی شروع کرادی۔"(۵)

---

(۱) غایۃ المقصود: ۱/۵۱۔ یہی بیان بعیم البشری بسعادۃ الدارین میں بھی موجود ہے، ص: ۲۷۔

(۲) نزہۃ الخواطر: ۷/۱۳۹۱۔

(۳) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۳۲-۳۳، اس واقعہ کا کوئی ماخذ نہیں بیان کیا گیا ہے۔ تراجم علمائے حدیث ہند، ص: ۱۵۰ میں بھی یہی واقعہ مذکور ہے۔

(۴) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۳۳، تراجم علمائے حدیث ہند، ص: ۱۵۰، دبستان حدیث، ص: ۲۸۔

(۵) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۳۳۔

مولانا نوشہروی لکھتے ہیں: ''نصیحت کارگر ہوئی، اپنے والد ہی سے پڑھنا شروع کیا، فارسی اور عربی کے مبادی تک آپہونچے، سید جواد علی کی رسائی یہیں تک تھی۔''(۱)

سولہ سال کی عمر میں جب گھر سے نکلنے کا فیصلہ کیا، اس وقت تک اچھی خاصی استعداد پیدا کرلی تھی۔ اپنے ساتھ خاص طور سے کتابوں کا بستہ لے جاتے ہیں۔(۲) اپنے شوق کتب بینی کا خود ہی ذکر کیا ہے، ۱۲۳۸ھ کے بارے میں لکھتے ہیں: ''شوق کتاب بینی اس وقت بہت زیادہ تھا''(۳) عظیم آباد پہنچ کر ''ترجمہ قرآن'' اور ''مشکوۃ'' کی تعلیم سے ابتدا کی۔ ان تمام باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس افسانہ میں حقیقت بہت کم ہے کہ ۱۶-۱۷ رسال کی عمر تک علم کی طرف بالکل رغبت نہیں تھی۔

خاص طور سے اگر یہ بات ذہن نشین رہے کہ ۱۲۱۶ھ میں جب آپ کی عمر سولہ سال کی تھی آپ گھر سے حصول تعلیم کے لیے نکلے تھے۔ یہ ممکن نہیں کہ صرف ایک سال کے اندر اندر فارسی کی اچھی خاصی مہارت پیدا کر کے عربی کی بھی اتنی استعداد پیدا کرلی ہو کہ ترجمہ قرآن اور مشکوۃ کے تعلیمی مرحلہ میں داخل ہو جائیں۔ اس مرحلہ کے لیے کم از کم دو سے تین سال کی مدت درکار ہوتی ہے۔

صاحب الحیاۃ بعد المماۃ نے میاں صاحب کے بیان شوق کتب بینی کو بڑے وسیع پس منظر میں پیش کیا ہے، لکھتے ہیں:

''اس تحریر اور نیز بعض اور تحریروں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کتب بینی کا شوق بہت تھا، مگر عربی استعداد جہاں تک تھی اس کا حال تو معلوم ہی ہو چکا ہے، پھر وہ کتابیں دیکھتے تھے، کس قسم کی؟ اس کا کچھ ذکر نہیں ...فارسی میں گھر ہی سے اچھی مہارت تھی، ...فارسی ہی کی کتابیں مطالعہ کرتے ہوں گے، .... ہزاروں اشعار اردو کے ان کو یاد تھے .... اردو شاعری کے نکات.... اور شاعروں کی نسبت ان کی رائے قابل وزن سمجھی جاتی تھی۔''(۴)

بہرحال میاں صاحب نے ابتدائی مراحل کی تعلیم ''بلتھوا'' میں حاصل کی، اس مرحلہ کے کسی مدرس کا نام کہیں مذکور نہیں ہے۔ عام طور سے گھروں اور مکتبوں میں پڑھانے والے مولوی

---
(۱) تراجم علمائے حدیث ہند، ص: ۱۵۰۔
(۲) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۳۳۔
(۳) مکاتیب نذیریہ، ص: ۶۱، خط نمبر ۵۳۔
(۴) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۳۹ حاشیہ۔

صاحبان کے ناموں کو ذکر کرنے کا اہتمام آج بھی نہیں کیا جاتا۔ اس کے بعد سورج گڑھ اور اس کے نواح کے علما سے بھی استفادہ کیا۔ والد صاحب کے علاوہ کسی اور شخصیت کا ذکر نہیں ملتا جس سے استفادہ کیا ہو، تاہم یہ بات اگر صحیح ہے کہ آپ کے گھرانے میں ہی علماء موجود تھے تو ان سے استفادہ بعید نہیں۔ ان کے علاوہ دیگر اشخاص سے بھی یقینی طور سے استفادہ کیا ہوگا، مگر ان کے نام ہمیں نہ معلوم ہو سکے اور نہ کوئی ذریعہ ہی ہے کہ معلوم کیا جاسکے۔

طلب علم کا سفر:

میاں صاحب ۱۲۳۶ھ میں اپنے گاؤں سے نکل کر عظیم آباد آجاتے ہیں۔ آپ کے تذکرہ نگار اس کی وجہ بتاتے ہیں کہ ان کے لیے مزید علم کا حصول گاؤں میں رہ کر ممکن نہیں تھا، کیوں کہ جس حد تک کوئی پڑھا سکتا تھا، اس مرحلہ تک پہنچ چکے تھے۔(۱) صاحب الحیاۃ بعد المماۃ نے یہ تاثر دیا ہے کہ سفر پر جانے میں ''ناداری اور تنگ دستی مانع تھی''(۲) لیکن بلا اجازت چپکے سے بھاگ کر جانے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ مولانا نوشہروی کا خیال ہے: ''گھر میں غربت مسلط تھی جس کی وجہ سے والد صاحب سے سفر کی اجازت طلب کرنا بے سود تھا۔''(۳)

ان دونوں بزرگوں نے گھر سے بلا اجازت نکلنے اور ''تنگ دستی'' کے ثبوت میں کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ اس لیے یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ تاہم بلا کسی خارجی ثبوت کے ان کو رد بھی نہیں کیا جاسکتا ہے، امکان تو بہرحال دونوں کا ہے۔ کاش کہ صاحب الحیاۃ بعد المماۃ نے ان تفاصیل کے سلسلے میں کسی حوالہ کا ذکر کیا ہوتا۔ جہاں تک غربت کا تعلق ہے مجھے اس کے تسلیم کرنے میں شدید تامل ہے۔ خاص طور سے اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ آپ کا خاندان صاحب جائداد تھا، ننھیال بھی باحیثیت تھا، میاں صاحب کو ننھیالی جائداد میں والدہ کے انتقال کے بعد حصہ ملا تھا جس کو آپ نے اپنے بھائی کو ہبہ کردیا تھا۔ خاندان کے من جملہ تمول کا ابتدا میں ذکر ہو چکا ہے۔ غریب خاندان اس عمر میں بچوں کو محنت مزدوری میں لگا دیتے ہیں، اس عمر میں تعلیم و تعلم

---

(۱) تراجم علمائے اہل حدیث، ص: ۱۵۰، سید جواد علی کی رسائی یہیں تک تھی۔
(۲) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۳۳، ۳۰، وطن میں گھر سے نکلنے کا پلان اور دوسری تفاصیل بھی ذکر کی ہیں۔
(۳) تراجم علمائے حدیث ہند، ص: ۱۵۰۔

کا سلسلہ نہ ہوتو مترگشتی ان کے بس میں نہیں ہوتی۔اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ آپ کی تعلیم کا اہتمام والد صاحب نے ہی کیا تھا۔آپ کے دو اور چھوٹے بھائی تھے دونوں عالم تھے، ظاہر ہے ان کی تعلیم والد صاحب کی مرضی سے ہی ہوئی تھی۔

عظیم آباد میں قیام:

میاں صاحب اپنے دوست بشیرالدین عرف امداد علی کے ساتھ عظیم آباد پہنچتے ہیں، ساتھ میں کتابوں کی ایک گٹھری بھی لے جاتے ہیں۔یہ سفر ۱۲۳۶ھ میں شروع ہوتا ہے۔ (۱)

صادق پور کے محلّہ ''تموہیہ'' میں شاہ محمد حسین مرحوم کے مکان میں ٹھہرتے ہیں، دوسرے طلبہ کے ساتھ قیام کر کے حصول علم میں لگ جاتے ہیں۔ (۲)

یہاں آپ کا قیام تقریباً چھ ماہ تک رہا (۳) آپ نے یہاں ترجمہ قرآن اور مشکوۃ شروع کی۔صاحب الحیاۃ بعد المماۃ نے ''غالباً ترجمہ قرآن اور مشکوۃ'' کے پڑھنے کا تذکرہ کیا ہے۔ (۴) البتہ دوسری جگہ پر بالجزم ذکر کیا ہے۔لکھتے ہیں: ''پٹنہ میں ترجمہ قرآن اور ترجمہ مشکوۃ پڑھ لیا تھا... مگر ترجمہ سے تو کام نہیں چل سکتا۔'' (۵)

مجھے شک ہے کہ پٹنہ میں آپ کو ترجمہ قرآن اور مشکوۃ شریف کا ترجمہ ازبر کرایا جاتا رہا ہوگا، اس کے امکان کی کوئی شکل نظر نہیں آتی، کیوں کہ عربی دانی کے بغیر ترجمہ حفظ کرانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، حفظ ترجمہ بعید از قیاس ہے۔میرا خیال ہے کہ وہاں کے مدرس یا مدرسین نے میاں صاحب کی عربی اور فارسی صلاحیت جانچنے کے بعد اس صف میں داخلہ دیا ہوگا۔ترجمہ قرآن اور مشکوۃ کے علاوہ بھی کتابیں رہی ہوں گی۔تاہم میاں صاحب نے محسوس کیا کہ ان کی صرف ونحو ابھی کمزور ہے جس پر مزید مشق کی ضرورت ہے۔خاص طور سے بلوغ المرام سے تعلیم

---

(۱) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۳۴ میں ۱۲۳۷ھ کا ذکر ہے، تاہم حاشیہ میں یہ لکھا ہے کہ تخمیناً آپ گھر سے اس وقت نکلتے ہوں گے جب سید صاحب بریلی سے نکلتے ہوں گے۔ص: ۳۵، عزیر شمس نے ''حیاۃ المحدث شمس الحق وآثارہ'' ص: ۲۶۷ میں اور مولانا سیالکوٹی نے تاریخ اہل حدیث، ص: ۴۲۶ میں سفر کی تاریخ ۱۲۳۶ھ ذکر کی ہے، یہی تاریخ صحیح ہے کیوں کہ سید صاحب کا قافلہ محرم ۱۲۳۷ھ میں پٹنہ میں تھا۔

(۲) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۳۴-۳۵، لگتا ہے کہ بلتھرا سے عظیم آباد تک سفر کی تفاصیل کا واحد مرجع الحیاۃ بعد المماۃ ہے، دوسرے حضرات نے یہ تفاصیل بسا اوقات لفظ بلفظ بلا حوالہ نقل کی ہیں۔

(۳) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۳۵۔

(۴) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۳۵۔

(۵) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۴۳-۴۵۔

کی ابتدانہ کرنا بذات خود ایک سوالیہ نشان قائم کرتا ہے۔ اگر صرف ترجمہ پڑھانا مقصود تھا تو اس کی ابتدا مشکاۃ سے کیوں ہوئی۔ مولانا ڈیانوی نے پٹنہ میں ان کے کسی تعلیمی مصروفیت کا ذکر نہیں کیا ہے۔(۱)

میاں صاحب کے پٹنہ میں قیام کا ایک خاص واقعہ یہ ہے کہ سید احمد شہید رحمہ اللہ کا قافلہ حج یہیں فروکش ہوا۔ جمعہ کی نماز پولیس لائن کے میدان میں ہوئی تھی اور سید اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے وعظ کیا تھا۔ میاں صاحب کہتے تھے: ''ہم اس وعظ ونماز میں شریک تھے، سارا میدان لین کا آدمیوں سے بھرا ہوا تھا، پہلی ملاقات سید احمد صاحب اور مولانا شہید سے یہیں پٹنہ میں ہوئی۔(۲)

کچھ تذکرہ نگاروں نے اس ملاقات سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے میاں صاحب کے ذہن میں یہیں سے دہلی جاکر تکمیل علم کی خواہش پیدا ہوئی خاص طور سے شاہ عبدالعزیز سے تعلیم کی تمنا کی۔ یہ بات اگرچہ بعید از قیاس نہیں تاہم اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ خاص طور سے جب کہ پٹنہ اور دہلی کا فاصلہ ۶ سالوں میں طے کیا یہ دعوی محل نظر ہو جاتا ہے۔

پٹنہ سے چل کر میاں صاحب غازی پور پہونچتے ہیں، بقول صاحب الحیاۃ بعد المماۃ یہاں پر چندے قیام کیا اور کچھ ابتدائی کتابیں مولوی احمد علی چریاکوٹی سے پڑھیں۔ پھر بنارس روانہ ہوگئے۔(۳) بنارس میں بھی مختصر قیام کیا، مگر کسی عالم سے استفادہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ بنارس میں میاں صاحب نے اپنی کچھ کتابیں فروخت کیں، ۹ر روپے ملے، جس سے سواری کا ٹٹو خریدا۔(۴) پھر بنارس سے الہ آباد روانہ ہوجاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ چند دنوں ایک مسجد میں رہنے کے بعد دائرہ شاہ اجمل میں آگئے،(۵) الہ آباد میں اپنے قیام کا میاں صاحب نے

---

(۱) غایۃ المقصود، ص:۵۱، اس سے اندازہ ہوتا ہے پٹنہ میں آپ کی تعلیمی مصروفیات بہت معروف نہیں تھیں۔

(۲) الحیاۃ بعد المماۃ، ص:۳۵، غالبا یہ مراد ہے کہ پہلی بار نماز جمعہ میں دیکھا، اس کے بعد پٹنہ کے زمانہ میں متعدد بار دیکھا ہوگا۔ پٹنہ کے علاوہ اور کہیں کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

(۳) الحیاۃ بعد المماۃ، ص:۳۷۔

(۴) الحیاۃ بعد المماۃ، ص:۳۷، ایک کتاب کے بیچنے کا ذکر ہے، بہر حال نو روپے کی ایک کتاب سمجھ میں نہیں آتی، مولانا نوشہروی نے معاملہ الٹ دیا ہے اور ٹٹو بیچ کر کتاب خریدنے کا ذکر کیا ہے!! بہر حال میاں صاحب نے سفر میں سواری کے استعمال کا ذکر کیا ہے جس سے ٹٹو خریدنے والی بات کی تائید ہوتی ہے۔

(۵) الحیاۃ بعد المماۃ، ص:۳۷۔

خود اپنی ایک تحریر میں ذکر کیا ہے، اپنے ایک شاگرد عبدالعزیز صاحب کو لکھتے ہیں:

"جمنا کے کنارے ایک مسجد ہے، ایام طالب علمی میں کچھ وقت یہاں گذارا ہے، مولوی زین العابدین مرحوم ومغفور کے ساتھ درس وتدریس کی صحبت گرم رہتی تھی، دوائر کے چندلوگوں کے ساتھ بھی خوب لمبی مجلس مذاکرہ ہوتی تھی۔"(۱)

میاں صاحب نے یہاں دائرہ اجمل شاہ میں اپنے قیام کا تذکرہ نہیں کیا ہے، صرف مولوی زین العابدین سے اس مسجد میں استفادہ کا ذکر ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ الہ آباد میں چھبن دوائر اور تکیے تھے۔ اس طرح میاں صاحب نے بلاتعیین بعض کے ذمہ داروں سے اپنے بحث ومباحثہ کا تذکرہ کیا ہے۔

میاں صاحب کو الہ باد اور مولوی زین العابدین سے بڑی انسیت ہوگئی تھی۔ عبدالعزیز الہ آباد میں تحصیل دار تھے ملنے دہلی جاتے تو میاں صاحب کہتے: "بھئی تمہارے آنے سے مولوی زین العابدین مرحوم یاد آجاتے ہیں، اور اپنی طالب علمی کے مزے اس وقت سب سامنے ہو جاتے ہیں۔"(۲) اس لیے دائرہ شاہ اجمل شاہ میں قیام ثبوت کا مستحق ہے۔ اگر چہ نوشہروی نے لکھا ہے کہ: "دائرہ اجمل شاہ میں رہ کر صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، اور جب تک زندہ رہے دائرہ اجمل شاہ کی یاد زبان پر رہی۔"(۳)

مولانا ڈیانوی نے الہ آباد میں قیام اور یہاں کے اعیان سے استفادہ کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"وصل إلى إله آباد وقرأ المختصرات من فنون شتى، مثل: مراح الأرواح، والزنجاني، ونقود الصرف، والجزولي ، وشرح مائة عامل، والمصباح، والضريري ، وهداية النحو وغير ذلك على جماعة من أعيان إله

---

(۱) مکاتیب نذیریہ، ص۹۷، خط نمبر۷۷۔ خط فارسی میں ہے، میں نے اپنا ترجمہ درج کیا ہے، آخری جملہ کے الفاظ یہ ہیں: "از چند اصحاب دوائر ہم جلسہ مذاکرہ بانجا کشیدہ ام" مترجم مکاتیب نے یہ ترجمہ کیا ہے: "دائرہ کے چند ہم درس اصحاب سے مذاکرہ علمی میں انتہا درجہ کی کشیدگی تھی۔" یہ ترجمہ غلط ہے۔ تقریبا لفظی ترجمہ یہ ہے: "بعض اصحاب دوائر کے ساتھ ہماری مجلس مذاکرہ انجام تک چلتی تھی۔"

(۲) الحیاۃ بعد المماۃ، ص:۶۴، مولوی عبدالعزیز کی رقم شدہ یادداشت کے حوالے سے۔

(۳) تراجم علمائے حدیث ہند، ص:۱۵۱، طبع الکتاب انٹرنیشنل دہلی۔

آباد۔(۱)
دائرہ اجمل شاہ میں قیام کیا ہوتا تو مولانا ڈیانوی اس کا ضرور ذکر کرتے۔

الہ آباد سے روانگی:

عام طور سے میاں صاحب کے تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ الہ آباد میں آپ کا قیام صرف سات آٹھ مہینے تک رہا، اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ میاں صاحب ۱۲۳۷ھ میں پٹنہ سے نکلے اور ۵؍رجب ۱۲۳۸ھ کو خواجہ پھول پور پہنچ گئے یہاں کی قلعہ والی مسجد میں آپ کے ہاتھ سے لکھی ہوئی ایک تحریر سے اس تاریخ میں یہاں ہونا ثابت ہوتا ہے، اس طرح یہ مدت اس سے زیادہ نہیں بنتی ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا سات آٹھ مہینے کی مدت، کم از کم آٹھ کتابوں کے پڑھنے کے لیے کافی ہے؟

یہ اس وقت ممکن ہے جب طالب علم کے پاس پہلے سے صلاحیت وذہانت ہو۔ میرے خیال میں میاں صاحب کے پاس صلاحیت تو موجود تھی، تاہم یہ بات قابل غور ہے کہ میاں صاحب "لمبے مذاکرات" کس موضوع پر کرتے رہے ہوں گے؟ معمولی صرف ونحو کے مسائل پر مذاکرات کے کیا معنی ہیں؟ پھر کیا یہ ممکن ہے کہ میاں صاحب کا الہ آباد میں قیام اس سے زیادہ رہا ہو اور اس طرح علمی ترقی کے ساتھ اصحاب دوائر سے بحث ومباحثہ کا سلسلہ بھی چلتا رہا ہو۔ مولانا ڈیانوی کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ الہ آباد کا قیام اس سے کافی لمبا تھا۔ "الہ آباد میں استفادہ" کے بعد لکھتے ہیں: "..... ثم ارتحل في سنة اثنتين وأربعين والمأتين إلى مدينة دهلي"(۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا ڈیانوی ۱۲۴۲ھ تک الہ آباد میں قیام کو ترجیح دے رہے ہیں۔

بعض اور باتوں کو ملا کر اس مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جہاں تک الحیاۃ بعد المماۃ کے مصنف اور دوسرے تذکرہ نگاروں کی بات ہے، وہ اس کے قائل ہیں کہ میاں صاحب

---

(۱) غایۃ المقصود ۱؍ ۵۱-۵۲، اسمائے کتب کی تفصیل الحیاۃ بعد المماۃ میں بھی ہے، ص: ۳۸۔ عزیر شمس نے پٹنہ سے دہلی کے راستے میں قیام الہ آباد کا ذکر کیا ہے، ص: ۲۶۷۔

(۲) غایۃ المقصود، ص: ۵۳۔ صاحب البشری بسعادۃ الدارین نے بھی یہی اقتباس نقل کیے ہیں، ص: ۲۷۔

موضع خوابہ پھول میں ۵؍رجب ۱۲۳۸ھ کو پہونچے اور دہلی ۱۳؍رجب ۱۲۴۳ھ کو ٹھیک پانچ برسوں کے بعد۔ یہ زمانہ آپ نے کہاں گذارا اور کیوں کر گذارا؟ بالکل تاریکی میں ہے۔[1] ان حضرات کا خیال ہے کہ "قلت زاد" اور "بے سروسامانی" کے سبب سے سفر میں ایسا غیر معمولی وقفہ ہوا ہوگا۔[2] مولانا سیالکوٹی لکھتے ہیں: "آخر آہستہ آہستہ راہ بے راہ سفر کرتے ۱۳؍رجب ۱۲۴۳ھ کو بدھ کے روز دہلی پہنچے۔"[3] اس سے بہتر توجیہ صاحب نزہۃ الخواطر کی ہے: "ثم سافر إلى دهلي وأقام في مقامات عديدة في أثناء السفر حتى دخل دهلي."[4] اس طرح دہلی پہنچنے تک یقینی طور سے کہیں نہ کہیں قیام ہوگا۔ مگر اس کی تفصیل معلوم نہیں۔

غربت اور تنگ دستی کی وجہ سے کانپور کے مضافات سے دہلی کا فاصلہ پانچ سال میں طے کرنا کئی وجوہ سے ناقابل قبول ہے۔

(الف) میاں صاحب کے پاس ایسا لگتا ہے ضروری زادسفر موجود تھا، خود لکھتے ہیں (کہ جب ۵/رجب ۱۲۳۸ھ کو خوابہ پھول پہنچے تو) "میں ایک ٹٹو پر تھا، ایک طالب بھی میرے ساتھ تھے، شوق کتب بینی اس وقت زیادہ تھا اور تمہاری طرح غصہ ور اور جلد بازی مجھے بہت زیادہ تھی۔"[5]

بتایا جاتا ہے کہ یہ ٹٹو آپ نے بنارس میں خریدا تھا، سواری اور مصاحب کے ساتھ سفر کرنا بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ میاں صاحب کے پاس زادراہ کی کمی نہیں تھی، اس پر مستزاد کہ غصہ اور جلد بازی۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وسائل کے لحاظ سے خود کفیل تھے، کسی کی پرواہ نہیں تھی۔

(ب) پٹنہ سے دہلی کا تک کا فاصلہ ۱۰۶۰ر کیلومیٹر بتایا جاتا ہے، یہ حالیہ مسافت کا تخمینہ

---

(۱) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۳۰۔ (۲) ایضاً۔

(۳) تاریخ اہل حدیث، ص: ۴۲۶۔

(۴) نزہۃ الخواطر: ۷/ ۱۳۹۱، طبع ابن حزم بیروت۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حال ہی میں ڈاکٹر بہاء الدین صاحب نے یہ تھیوری پیش کی ہے: "میاں صاحب نے پٹنہ میں سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی ہوگی اور پھر بنارس، الہ آباد وغیرہ ہوتے ہوئے پانچ سال تک ان کی دعوت کے سرگرم داعی رہے ہوں گے" میرا خیال ہے کہ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ سید صاحب نے جہاد کی دعوت ۱۲۳۷ھ میں سفر حج سے واپسی کے بعد شروع کی تھی (سیرت سید احمد شہید: ۱/ ۳۷۹، ۴۳۹) البتہ جس طرح کا خیالی پورا مولانا سندھی نے بنایا ہے ہمارے ڈاکٹر صاحب کی تھیوری اس کا بہترین جواب ہے۔

(۵) مکتوبات نذیریہ ص: ۶۱، خط نمبر: ۵۳۔

ہے جس میں ریل اور شارع عام (ہائی وے) کا اعتبار کیا گیا ہے۔ اگر پرانے پیدل کے راستے کا اعتبار کیا جائے تو یہ مسافت شاید کچھ کم ہی ہو، میاں صاحب پٹنہ سے چل کر ۱۲۳۸ھ میں کانپور کے قریب خواجہ پھول پہنچتے ہیں، اس طرح آپ نے کم از کم ۵۹۰ رکلومیٹر کا فاصلہ ایک سال کے اندر اندر طے کر لیا تھا۔ دلی اتنی دور نہیں تھی کہ وہاں تک پہنچنے میں پانچ سال لگ جائیں۔ صرف ۴۷۰ رکلومیٹر کا فاصلہ باقی تھا۔ آپ کی مالی یا جسمانی کیفیت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

(ج) الہ آباد سے چل کر میاں صاحب چھبرہ مئو پہونچتے ہیں۔ یہ قصبہ قنوج سے قریب دہلی کے راستے لب سڑک پر واقع ہے۔ قنوج سے اس کا فاصلہ ۱۶-۱۷ ارکوس ہے۔ نواب صدیق حسن خان صاحب کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: ''رئیس قصبہ قاضی بدرالدین صاحب مغفور بسیار مہمان نواز و کریم النفس بودند، و برادران قاضی مرحوم ہم غنیمت بودند۔ فقیر باوان شباب در آنجا رسید قاضی صاحب و برادران عالیشان موصوف احسانہا نمودہ اند۔''(۱)

جس انداز سے میاں صاحب قاضی صاحب اور ان کے برادران کے احسان کا ذکر کر رہے ہیں وہ ایک دو وقت کی دعوت نہیں ہو سکتی ہے۔ اس جگہ اپنے جانے کا تذکرہ میاں صاحب نے اپنے چند اور خطوط میں کیا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: ''نیا نزرگ ایشان بہنگام سفر بندہ از الہ آباد حسبۃ للہ مسافر نوازی و برادرانہ مہمانی فرمودہ بودند، ہمچنین رئیس کریم النفس نیافتہ''(۲) مزید لکھتے ہیں: ''قاضی صاحب کا انتقال باعث قلق ہے۔ فقیر نے ان کے لیے دعائے خیر ہمیشہ کی ہے اور وہ مسافر نواز دوست پرور تھے۔ اللہ تعالی ان کو مغفرت دے کر صادقین میں شمار فرمائے گا۔''(۳) قاضی صاحب جیسا رئیس جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ: ''ان سا کریم النفس کوئی اور نہ مل سکا'' اور جس کے لیے وہ زندگی بھر دعا فرمائیں، کیا یہ ممکن ہے کہ وہ میاں صاحب کی ضروریات کا پاس نہ کرے؟

میاں صاحب کے خطوط پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ تاثر ملتا ہے کہ قاضی صاحب کے

(۱) مکتوبات نذیریہ ص:۶۳، خط نمبر:۵۶۔ یہ جگہ ''چھبرامئو'' CHEBRAMAU کے نام سے معروف ہے۔ مکتوبات میں ''چھپرہ'' لکھا گیا ہے۔

(۲) مکاتیب نذیریہ ص:۲۷، خط نمبر:۳۸۔ ''آپ کے نانا بزرگ نے میرے الہ آباد سے سفر کے درمیان للہ فی اللہ مسافر نوازی اور برادرانہ مہمان نوازی کی۔ ان سا کریم النفس رئیس نہیں دیکھا۔''

(۳) کذا ۲۸۱، خط نمبر:۳۹، مرقوم ۲ر شوال ۱۲۹۸ھ۔

پورے خاندان سے ان کے مراسم استوار ہو گئے تھے۔ عبدالعزیز صمدانی کے والد قاضی صاحب کے داماد تھے۔ یہ اگر چہ حنفی تھے تاہم میاں صاحب کے بڑے معتقد۔ ان سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی تھا۔ انہیں کی درخواست پر عبدالعزیز کو فراغت سے پہلے نکاح کرنے پر آمادہ کیا۔ [۱] ان کے گھر صمدن بھی جانے کا ذکر کیا ہے۔ [۲] عبدالعزیز صاحب میاں صاحب سے نہ صرف خط وکتابت کرتے تھے بلکہ کئی ذاتی معاملات میں مشورہ بھی لیتے تھے۔ ان تفاصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ پورے خاندان سے میاں صاحب کے قریبی تعلقات استوار ہو جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ قاضی صاحب کے خاندان کی مساعدت غیر معمولی رہی ہوگی، اس لیے ''قلیل زادراہ'' ''عسرت'' اور ''تنگ دستی'' کو دہلی پہونچنے میں تاخیر کی وجہ نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔

پانچ سال کی مدت کہاں گزری؟

عبدالعزیز صمدانی صاحب میاں صاحب کے بڑے چہیتے شاگرد تھے۔ قاضی بدر الدین کے نواسہ ہونے کی وجہ سے میاں صاحب کو بہت عزیز تھے۔ انہوں نے اپنی یادداشت لکھی تھی۔ لگتا ہے الحیاۃ بعد المماۃ کے مؤلف کی اس تک دسترس تھی، کئی جگہوں پر اس سے استفادہ کیا ہے۔ [۳] مجھے نہیں معلوم کہ یہ یادداشت طبع ہوئی ہے کہ نہیں یا اس کا مخطوطہ ہی کہیں محفوظ ہے کہ نہیں؟ اگر یہ دستیاب ہو جائے تو بہت ساری معلومات کا انکشاف ہو سکتا ہے۔

تاہم موجودہ مواد کی بنا پر یہ نظریہ قائم کیا گیا ہے کہ آپ کا سفر بے ترتیبی سے جاری تھا۔ راہ بے راہ سفر ہو رہا تھا کہ ضلع کانپور میں مکرر پہنچے۔ [۴]

اگر مولانا ڈیانوی کا اندازہ صحیح ہے کہ آپ ۱۲۴۲ھ کو الہ آباد سے دہلی کے لیے نکلتے ہیں تو پھر یہ شکل بنتی ہے۔

آپ اپنے دوست کے ہمراہ الہ آباد سے نکلتے ہیں۔ کانپور راستے میں پہلے پڑتا ہے۔ یہاں سے چل کر چھبرہ مئو (Chebramau) آتے ہیں۔ یہاں قاضی صاحب اور ان کے

---

(۱) کذا: ۳۶-۳۷، خط نمبر: ۳۸۔

(۲) کذا: ۶۳، خط نمبر ۵۶۔

(۳) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۱۷۳، ۱۸۲، ۲۱۵، وغیرہ۔

(۴) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۳۸، تاریخ اہل حدیث، سیالکوٹی صاحب نے راہ بے راہ کی تعبیر کو اخذ کیا ہے تاہم دوبارکان پور آنے کا ذکر نہیں ہے، ص: ۲۲۶۔ بھٹی صاحب نے مزید تفصیل سے ذکر کیا ہے، دبستان حدیث، ص: ۳۰۔

خانوادہ سے ملاقات ہوتی ہے، میاں صاحب ان کے الطاف کریمانہ سے مستفید ہوتے ہیں اور
دہلی کے بجائے کچھ دن یہاں ٹھہرتے ہیں، ان کے داماد کا گھر صمدن ضلع فرخ آباد میں ہے۔
وہاں بھی جاتے ہیں۔ اس کا تذکرہ نواب صاحب والے خط میں کرتے ہیں۔ (۱) اس کو جمرا
مئواور قنوج کے راستہ پر بتاتے ہیں۔ قنوج کا ذکر جس انداز میں کیا ہے لگتا ہے اس کو نہ صرف دیکھا
تھا بلکہ اچھی طرح واقف بھی تھے۔ عبدالعزیز صاحب کو لکھتے ہیں کہ کتاب فاروق فی الحدیث
اپنے چچا یا پھر قنوج سے حاصل کر کے ساتھ لانا۔ نواب صاحب کے نام خط میں بھی قنوج کا ذکر
ہے۔ بہر حال صمدن سے دہلی کے بجائے الہ آباد واپس آجاتے ہیں اور یہیں پر تعلیم کی تکمیل
کرتے ہیں (صمدن فرخ آباد میں واقع ہے۔ یہاں سے دہلی کا فاصلہ صرف ۲۷۰ رکلومیٹر بچتا ہے
لیکن دہلی کے راستے سے ہٹ کر ہے) میرا خیال ہے کہ آپ کے ساتھی ہم سفر نے یہیں سے اپنا
رستہ جدا کر لیا تھا۔ الہ آباد سے پھر ۱۲۴۲ھ میں دہلی کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ بروز بدھ.
۱۳ رجب ۱۲۴۳ھ میں دہلی پہنچتے ہیں۔ (۲) مفتی شجاع الدین کے گھر پر قیام کیا، پندرہ دن بعد
پنجابی کٹرہ کی مسجد میں مولانا عبدالخالق (م ۱۲۶۱ھ) سے پڑھنا شروع کرتے ہیں۔
نحو کی مشہور کتاب کافیہ شروع کی پھر قطبی، مختصر المعانی، شرح وقایہ، نورالانوار اور حسامی
کی تعلیم حاصل کی۔ (۳)
ان کے علاوہ شیر محمد قندھاری (م ۱۲۵۰ھ) مولوی جلال الدین ہروی، مولوی کرامت
علی اسرائیلی، مولوی محمد بخش عرف تربیت خاں، عبدالقادر رام پوری (۴) ملا سعید بشاری اور حکیم نیاز
احمد بسوانی سے استفادہ کیا۔ (۵)

---

(۱) مکاتیب نذیریہ، ص: ۲۳، خط نمبر: ۵۲۔
(۲) الحیاۃ بعد المماۃ، میاں صاحب کی قلمی یادداشت، ص: ۵۱، مؤلف ایک اور جگہ لکھتے ہیں: بعض تحریروں میں میاں صاحب
نے ۱۲۳۲ھ میں دہلی پہنچنے کا ذکر کیا ہے مگر ۱۲۴۳ھ والی تحریر مفصل ہے، دن کی تعیین بھی ہے، یہی بوجوہ صحیح ہے، ص: ۴۰۔
(۳) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۳۵۔ کافیہ سے نحو کی ابتدا کا یہ مطلب نہیں کہ نحو میں آپ کی صلاحیت بس اتنی تھی، بعض مدرسین باصرار
تعلیم کی ابتدا ابتدائی کتابوں سے کرتے ہیں۔ پھر جلد ہی بڑی کتابیں شروع کراتے ہیں اس طرح طالب علم کو استاد کا انداز سمجھنے
میں آسانی ہوتی ہے۔
(۴) مآثر المقصود: ۵۲۔ ان کتابوں کی تفصیل مذکور ہے جو ہر استاد سے پڑھیں، ایضاً الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۳۵-۳۷، البشری
بسعادۃ الدارین، ص: ۲۷-۲۸، تراجم علمائے حدیث ہند میں بھی عبدالقادر کے علاوہ دوسرے اساتذہ کا ذکر ہے، ص: ۱۵۱-۱۵۲۔
(۵) ان دو اساتذہ کا تذکرہ صاحب الحیاۃ بعد المماۃ نے کیا ہے، ص: ۳۷۔ مولانا سیالکوٹی نے بھی ذکر کیا ہے، تاریخ اہلحدیث،
ص ۴۲۶۔

میاں صاحب نے اپنی تحریر میں مولانا عبدالخالق کے علاوہ صرف مولوی جلال الدین، مولوی شیر محمد قندھاری اور محمد سعید بشاری کا بطور خاص ذکر کیا ہے اور علوم آلیہ کی تکمیل کی مدت ساڑھے تین سال بتائی ہے۔ [1] مولانا ڈیانوی نے علوم آلیہ کی تحصیل کی مدت پانچ سال بتائی ہے۔ [2] یہ تصریح میاں صاحب کے اپنے بیان سے مختلف ہے۔ وہاں سے علوم آلیہ کی تکمیل کے بعد علم فقہ اور حدیث کی تحصیل میں "ہمہ تن" متوجہ ہونے کا ذکر اسی یادداشت میں کیا ہے، مگر کسی استاد کی تعیین نہیں کی ہے۔ دہلی میں ہوتے ہوئے شاہ اسحاق محدث دہلوی کی درس گاہ کا رخ نہ کرنا بعید از قیاس ہے۔ میاں صاحب نے ایک جگہ ۱۲ یا ۱۳ ؍سال تک مولانا شاہ اسحاق سے استفادہ کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح یقینی طور سے ۱۲۴۵ھ-۱۲۴۶ھ سے مولانا سے استفادہ شروع کیا ہوگا۔ [3] میاں صاحب نے اپنی یادداشت میں کسی استاد اور کتاب کا تعین نہیں کیا ہے۔ لیکن مولانا عبدالخالق سے استفادہ جاری تھا کیوں کہ ۱۲۴۹ھ میں ان سے درس بخاری شروع کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔

میاں صاحب نے اپنی اس یادداشت میں جو ۱۱؍محرم ۱۲۹۹ھ میں لکھی تھی بتصریح لکھتے ہیں کہ صحیح بخاری مولانا عبدالخالق مرحوم سے پڑھنی شروع کی جس میں مولوی رحمت اللہ بیگ شریک درس تھے، اسی زمانہ میں شاہ اسحاق رحمہ اللہ سے بھی بخاری پڑھنی شروع کی۔ شاہ صاحب کا درس علی الصباح ہوتا تھا۔ اس کے بعد مولانا عبدالخالق کے درس میں شامل ہو جاتے تھے۔ مولانا عبدالخالق نے بخاری سات مہینے میں ختم کروائی جب کہ شاہ اسحاق صاحب کے یہاں ۹ مہینہ میں ختم ہوئی۔ [4]

میاں صاحب نے شاہ اسحاق مرحوم سے اس کے بعد صحیح مسلم، ہدایہ، جامع صغیر اور کنز العمال کا کچھ حصہ پڑھا۔ دوبارہ بخاری کے ایک اور ختم میں شریک ہوئے جو تین یا چار ماہ میں مکمل ہوا۔ [5] اجازت اور سند بہر حال حجاز روانگی سے قبل لکھی گئی۔

اس طرح تقریباً سات سال کی مدت دہلی میں حصول علم میں بسر کی اور فقہ حدیث اور تفسیر میں رسوخ حاصل کیا۔ لیکن اس کے باوجود شاہ اسحاق صاحب سے استفادہ کا سلسلہ آپ کی

---

(۱) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۵۱۔
(۲) غایۃ المقصود: ۱/۵۲۔
(۳) الحیاۃ بعد المماۃ، ص ۵۳ حاشیہ۔
(۴) قلمی یادداشت، بحوالہ الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۵۲۔
(۵) قلمی یادداشت، بحوالہ الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۵۳۔

ہجرت تک جاری رہا۔ اس نیازمندانہ تعلق کی مدت ۱۲، ۱۳ر سال تک محیط ہے۔ [۱]

شادی:

زمانہ طالب علمی میں آپ کے استاد محترم مولانا عبدالخالق نے آپ کو اپنی دامادی کا شرف بخشا۔ ۱۲۴۸ھ میں آپ کا عقد ہوا۔ [۲] بقول مؤلف واقعات دارالحکومت دہلی یہ شادی شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب کی رائے اور مشورہ سے ہوئی تھی۔ نکاح شاہ اسحاق صاحب نے پڑھایا، شرکت شاہ محمد یعقوب اور تلامذہ شاہ اسحاق صاحب نے کی۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ کی شادی شدہ زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ آپ کی پہلی اولاد میاں سید شریف حسین کی ولادت ۱۲۴۸ھ کے آخر میں ہوتی ہے۔ میاں صاحب کی دوسری اولاد آپ کی بیٹی تھیں۔ ان کا نکاح میر شاہ جہاں صاحب سے ہوا تھا۔ دونوں کا قیام میاں صاحب کے ساتھ رہا۔ شادی سے پہلے میاں صاحب کا قیام شروع میں اپنے سسر کے مکان پر تھا۔ [۳] شادی کے فوراً بعد کہاں ٹھہرے، اس کا تذکرہ نہیں۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ آپ نے اس کے بعد بھی چند سال طلب علم میں گذارے۔ ہوسکتا ہے بیوی میکے میں ہی رہی ہو۔ واقعات دارالحکومت جو آپ کے ایک سسرالی رشتہ دار کی تالیف ہے۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء تک میاں صاحب کی فیملی اپنے میکہ ہی میں تھی، حیات النذیر میں بھی یہی مذکور ہے۔

بہرحال بعد میں میاں صاحب کرایہ کے مکان میں رہنے لگے۔ پوری زندگی کرایہ دار کی حیثیت سے رہے۔ حیات النذیر کے مؤلف کا دعوی ہے کہ ۱۸۵۷ء میں میاں صاحب کا ذاتی مکان زیر تعمیر تھا۔ ہنگامہ کی وجہ سے تکمیل نہ ہوئی اور بعد میں مسمار کردیا گیا۔ لیکن اس دعوی کی تصدیق کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں حیات النذیر پر اعتماد مشکل ہے۔

اولاد واحفاد:

جیسا کہ ذکر ہوا ہے آپ کی دو ہی اولاد تھی۔ میاں شریف حسین نے آپ سے بھی علم

(۱) میاں صاحب کی یادداشت بحوالہ الحیاۃ بعد المماۃ ص: ۵۳، حاشیہ ایضاً ص: ۵۵۔

(۲) الحیاۃ بعد المماۃ ص: ۴۸، نیز اندازہ عقد آغاز ۱۲۴۶ھ میں ہوا ص: ۵۳ مولانا [illegible] نے ۱۲۴۶ھ کے آخر میں نکاح کا ذکر کیا ہے۔ مؤلف واقعات دارالحکومت نے بھی ۱۲۴۶ھ میں عقد کا ذکر کیا ہے جو غلط ہے۔ (۲/۲۶۹) میاں صاحب کی تحریر کے مطابق اقامت دہلی کے پہلے سال [illegible] کا آخر ہے جو ۱۲۴۶ھ ہی بنتا ہے۔

(۳) الحیاۃ بعد المماۃ ص: ۱۳۹۔

حاصل کیا۔ دوسرے علماء سے بھی استفادہ کیا۔[1] بڑے ذی علم اور باکمال شخصیت کے مالک تھے۔ میاں صاحب کے فتاوی کے نقل کا انتظام انہوں نے ہی کیا تھا۔ میاں صاحب کی مسجد کے امام تھے۔ لمبی نمازیں پڑھتے تھے۔[2] آپ کا انتقال ۶ جمادی الاولی ۱۳۰۴ھ کو ہوا۔ عمر پچپن سال تھی۔ دولڑکے حافظ عبدالسلام اور مولوی ابوالحسن اور کئی لڑکیاں مولانا شریف حسین کی یادگار تھیں۔ سب کی پرورش میاں صاحب نے کی۔

بیٹی کی کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔[3] تین لڑکیاں تھیں۔ وہ بھی میاں صاحب ہی کی کفالت میں تھیں۔ آخر میں آپ کی بیٹی اور نواسیوں نے دس ماہ سے زائد آپ کی مکمل دیکھ بھال کی۔ آپ کی بیوی کا انتقال ۱۴ رمضان ۱۲۸۷ھ مطابق ۱۸۷۰ء بروز جمعرات کو ہو گیا تھا۔

تدریس:

میاں صاحب ۱۲۴۹ھ تک رسمی تحصیل سے فارغ ہو چکے تھے۔ تاہم شاہ اسحاق رحمہ اللہ سے استفادہ کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۲۵۸ھ میں شاہ صاحب کی ہجرت حجاز کے بعد تدریس کا باقاعدہ آغاز کیا۔[4] لیکن اس سے کئی سال پہلے درس وتدریس کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا جو آپ کے خسر کی نگرانی میں تھا۔ یہ سلسلہ ۱۲۵۴ھ سے پہلے کا ہے کیوں کہ نواب قطب الدین کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۲۵۴ھ سے بہت پہلے میاں صاحب نے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔

سر سید نے آثار الصنادید ۱۲۶۳ھ-۱۸۴۷ء کے قریب چھاپی تھی۔ اس کی تیاری میں ڈیڑھ سال کا وقت لگا تھا، گویا کہ یہ تحریر ۱۲۶۲ھ کی ہوگی، اس میں میاں صاحب کی تدریس کا ذکر

---

(۱) آپ کو علامہ حسین یمانی اور نواب صدیق حسن خان سے اجازت حدیث حاصل تھی۔

(۲) الحیاۃ بعد المماۃ سے باختصار صاحب نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے کہ پڑھ لکھ کر پڑھانے اور فتوی کی اہلیت پیدا کی اس وقت سے ان کے والد نے فتوی نویسی کی ساری ذمہ داری سونپ دی۔ (نزہۃ الخواطر: ۱۲۲۳/۷ طبع ابن حزم) شیخ حسین یمانی رحمہ اللہ نے لکھا: "العلامة الأريب والشريف الفاضل النسيب السيد شريف حسين" نواب صاحب نے لکھا: "السيد العلامة كريم النجاد عريق المحد والفخار السيد شريف حسين۔"

(۳) ایک لڑکا بدر الاسلام تھا جس کا انتقال ۱۰-۱۱ رسال کی عمر میں ہو گیا تھا۔ میاں صاحب کی ایک صاحب زادی سیدہ نساء کا انتقال بھی بچپن میں ہو گیا تھا۔

(۴) صاحب الحیاۃ بعد المماۃ یکم محرم ۱۲۵۹ھ سے تدریس کا آغاز بتاتے ہیں ص: ۶۷۔

ہے کہ مولانا عبدالخالق کے ساتھ درس و تدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔[1] مولانا عبدالخالق کا انتقال ۱۲۶۱ھ میں ہوا ہے۔ انتقال سے پہلے وہ تدریس سے دستکش ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی معیت میں تدریس اس سے بھی پہلے ہوگی۔ لگتا ہے تقریباً ۱۲۴۹ھ کے بعد میاں صاحب نے اپنے خسر کے ساتھ تدریس کا کام کرنا شروع کیا، ابتداءً نحو صرف پڑھاتے تھے۔ صاحب الحیاۃ بعد المماۃ نے میاں صاحب کا قول ذکر کیا ہے کہ ابتداء میں نے سات آٹھ برس صرف صرف و نحو وغیرہ کا درس دیا ہے۔[2] ان کا خیال ہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ شاہ اسحاق سے پڑھتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ شاہ اسحاق کے یہاں سے فراغت ۱۲۴۹ھ میں ہوگئی تھی تاہم ان سے استفادہ کا سلسلہ ان کی ہجرت تک جاری رہا، یہ تدریس اسی زمانہ کی ہے۔ شاہ اسحاق ۱۲۵۸ھ میں ہجرت کرتے ہیں۔ اس طرح میاں نے اپنے دروس کا دائرہ وسیع کرلیا اور تمام فنون کی کتابیں پڑھانے لگے۔ ۱۲۶۱ھ میں آپ کے خسر مولانا عبدالخالق کا انتقال ہوا تو یہ ذمہ داری اور بڑھ گئی۔[3] مولانا ڈیانوی اور دوسرے تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ آپ نے اورنگ آبادی مسجد میں ۱۲۵۹ھ میں اپنا مستقل حلقہ درس قائم کیا، جہاں آپ ہر علم و فن کی کتابیں پڑھاتے تھے۔ فقہ کی تدریس پر خاص توجہ تھی۔ بعد میں اپنے آپ کو صرف فقہ، حدیث اور تفسیر القرآن کی تدریس تک محدود کرلیا۔[4] ۱۲۷۰ھ میں تذکرہ نگار اس تبدیلی کی نشان دہی کرتے ہیں، گویا ۱۸۵۷ء سے تین سال پہلے کی بات ہے۔ اس جگہ آپ کی تدریس کا سلسلہ ۱۸۵۷ء تک جاری رہا پھر تقریباً تین یا چار سال تک دہلی اجڑی رہی۔ پھر ۵۹-۱۸۶۰ء مطابق ۱۲۷۵-۱۲۷۶ھ میں ریلوے اسٹیشن کی وجہ سے اس مسجد کو شہید کر دیا گیا۔ یہ مسجد میاں صاحب

---

(۱) الحیاۃ بعد المماۃ میں سرسید کی عبارت کا لمبا اقتباس ہے، ص:۳۶۔ البتہ مجھے آثار الصنادید میں الحیاۃ بعد المماۃ میں نقل شدہ عبارت نہ مل سکی۔ دیکھیے ص:۲۹۹، مسجد اورنگ آبادی کا ذکر۔ البتہ میاں صاحب کا ذکر بڑے وقیع الفاظ میں کیا ہے اور تدریس کا بھی تذکرہ ہے۔ صاحب الحیاۃ بعد المماۃ کی نقل کردہ عبارت میں تصریح ہے کہ مسجد اس وقت باقی تھی اور تدریس کا عمل جاری تھا۔

(۲) الحیاۃ بعد المماۃ، ص:۵۳، ایضاً ص:۲۱۱۔ اورنگ آبادی مسجد میں اہل حدیث اور احناف کی چپقلش کا ذکر ایک نئی کتاب "مدارس اہل حدیث" شائع کردہ مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند میں ہے۔ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ مولانا عبدالخالق صاحب خود اہل حدیث نہیں تھے۔ میاں صاحب اس کے کافی دن بعد تک خود فقہ حنفی پر اعتماد کرتے تھے۔

(۳) حاشیہ تحفۃ العرب والعجم، ص:۳۰۱۔

(۴) ج ۲ المقصود ۱/ ۵۳۔

کے خسر مولانا عبدالخالق کی تولیت میں تھی۔ ان کے صاحب زادے عبدالقادر امام مسجد تھے۔ اس کے بعد میاں صاحب پھاٹک حبش خان کی مسجد میں منتقل ہو جاتے ہیں اور اس کو اپنا مستقر بنا لیتے ہیں۔ گویا ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد مسجد اورنگ آباد میں واپس نہیں جا سکے۔ پھاٹک حبش خان کی یہی مسجد مدرسہ میاں نذیر حسین کے نام سے منسوب ہے۔ یہ مسجد گلی ہنگا بیگ میں واقع ہے، میاں صاحب نے خود ہی اس میں طلبہ کی رہائش کے کمرے اور مناسب سہولیات بنوائیں۔ (۱)

اس مدرسہ سے دنیا بھر سے آئے ہوئے تشنگان علم سیراب ہوئے۔ تن تنہا اس بوریہ نشین نے قرآن وسنت کی خدمت کرنے والی ایک فوج تیار کر دی اور اتباع کتاب وسنت کے مشن کو پوری قوت سے جاری کر دیا۔

مدرسہ کا نظام:

میاں صاحب نے یہ بات محسوس کی کہ کتاب وسنت کی تحریک کو آگے بڑھانے کا سب سے بہتر ذریعہ یہی ہے کہ اس کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: "میرے یہاں پیری مریدی کی دوکان نہیں۔ ہاں مدرسہ ہے جس میں خدا تعالی ورسول اللہ ﷺ کے احکام پڑھائے جاتے ہیں۔ (خدا کیا ہے اور بندہ کیا ہے) بتایا جاتا ہے۔ دنیا بھر کی بری باتوں سے بچنا، اچھی راہ پر چلنا، کسی کو نہ ستانا سکھایا جاتا ہے۔" (۲)

ایک نومسلم کو لکھتے ہیں:

"پیش من زود بیائید و در اینجا درس کتاب وسنت بگیرید چہ کی ماشاء اللہ تعالی در نحو بصیرت معقول میدارند، جانب کتب ادب میلے دارند، دریں مدرسہ آنہم ممکن است" (۳)

یعنی آپ میرے پاس جلد آ جائیں، یہاں کتاب وسنت کا درس لیں۔ آپ کو نحو کی معقول معلومات ہیں، کتب ادب کی طرف بھی میلان ہے۔ اس جگہ اس کی تعلیم بھی ہو سکتی ہے۔

مدرسہ کا خرچ ہمیشہ عوام کی مدد سے چلتا تھا تاہم اگر آپ کو علم ہوتا ہے کہ دینے والا خود حاجت مند ہے تو رقم واپس کر دیتے تھے۔ (۴) عوامی چندے وغیرہ کا رجحان بالکل نہیں تھا۔

(۱) صاحب الحیاۃ بعد المماۃ لکھتے ہیں: آپ کو اس کا فکر کبھی نہ ہوا کہ مدرسہ کی عمارت جو تعمیر ہو رہی ہے اس کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا، ص: ۱۶۱۔

(۲) مکاتیب نذیریہ، ص: ۲۳، خط نمبر ۱۲۔

(۳) مکاتیب نذیریہ، ص: ۱۱، خط نمبر: ۲۔

(۴) دیکھیے مکاتیب، ص: ۱۱۹، خط نمبر ۱۱۸۔

مولوی جمال الدین مدارالمہام بھوپال نے کہا ریاست بھوپال کو مدد کے لیے لکھیں تو مدد مل سکتی ہے۔ ان کی پیشکش کو شکریہ کے ساتھ رد کر دیا، لکھا:

"مرا ہمچون لغو تحریکھا ہمیشہ اجتناب است، بر در خداوند تعالیٰ نشستہ درس میدہم وے تعالیٰ شانہ از خزانہ غیب اعانت مدرسہ و متعلمین خواہد کرد، چہ کہ مرا از رجوع خدمت اغنیاء کراہتے است۔ بندہ فقیر برائے خود نمی خواہد، دریں جا آوردہ مرا، و طالبان را روزی کافی وافی می بخشید و رساند پس مایہ قناعت خود فروختن کار ابلہان است۔"(۱)

میں اس طرح کی لغو تحریکات سے ہمیشہ بچتا ہوں۔ اللہ کے در پر بیٹھ کر درس دیتا ہوں۔ وہ خزانہ غیب سے مدرسہ اور طلبہ کی مدد کرتا ہے۔ امراء سے طلب کرنے میں مجھے کراہت ہے۔ میرے اور طلبہ کی روزی روٹی کے لیے سب کچھ ملتا ہے۔ یہ قناعت کی دولت سے دستبرداری بیوقوفوں کا کام ہے۔

تاہم سخت ضرورت کے وقت اپنے خاص مخلصین کو اعانت کی طرف کبھی کبھی متوجہ کر دیتے تھے۔ ایک خط میں مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی اور مولانا عبدالرحیم صاحب کو لکھتے ہیں:"(ترجمہ) ابھی ایک اور بات ہے مدرسہ میں ۳۲ طلبہ ہیں ...قحط سالی اور گرانی میں گذر ہو رہا ہے ...ناچار ہو کر آپ کو لکھا کہ فوراً اعانت کریں۔"(۲)

نواب صاحب کے زمانے میں بھی مدد کے لیے ان کو لکھا تھا، کیوں کہ ان کی وفات کے بعد ۱۰۰ ار روپے کی اعانت کی منظوری پر شکریہ کا خط بیگم صاحبہ کو لکھا۔(۳)

اہل دہلی کی اعانت کے مشکور تھے، لکھتے ہیں:"کجا دیار شرقی کجا حضرت دہلی بعد المشر قین، ہمیں خدمت کتاب و سنت صرار سانیدہ، دہلویاں مرا خیر مقدم کردہ از اعانت و نصرت نوازش فرمودہ اند"(۴) کہاں دہلی اور پورب کا علاقہ، مجھے کتاب و سنت کی خدمت کے لیے یہاں پہونچایا۔ اہل دہلی نے میرا استقبال کیا ہے اور خوب نوازش کی۔

عام طور سے منتہی طلبہ تکمیل کے لیے آتے تھے اور میاں صاحب کے پاس دو سے تین سال گذارتے تھے۔ ایک خط میں عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

---

(۱) مکاتیب نذیریہ، ص: ۱۰، خط نمبر ۷۔

(۲) مکاتیب نذیریہ، ص: ۹۲-۹۳، خط نمبر ۹۲۔

(۳) مکاتیب نذیریہ، ص: ۱۵۹، خط نمبر ۱۶۲۔

(۴) مکاتیب نذیریہ، ص: ۱۲۵، خط نمبر ۱۲۶۔

''دو وسہ سال تا فراغ علم تفسیر و حدیث در اینجا ماند و بود منظور باشد تشریف آرند، چندے دریں جا ماندن و نا کام واپس شد ہرگز پسندیدہ امر نزد خردمندان نیست۔''(۱)

مدرسہ میں طلبہ آتے رہتے تھے، بعض خطوط میں روز ایک دو طلبہ کے آنے کا ذکر ہے۔(۲) مجھے ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ ۵۷ طلبہ کے زیر درس ہونے کا ذکر ملا ہے۔(۳) کم سے کم ۳۲ طلبہ کا ذکر ہے۔ ۴ر شوال ۱۲۹۸ھ کے خط میں ۴۵ر منتہی طلبہ کا زیر درس ہونا مذکور ہے۔(۴) کبھی رمضان اور کبھی گرمیوں میں تعطیل ہوتی تھی۔ کئی خطوط میں تعطیل کا ذکر ہے تاہم کبھی کبھی رمضان بھی درس وتدریس میں گذرتا تھا۔ مولانا رحیم آبادی کے رمضان میں پڑھنے کا ذکر ہے۔ تدریس کا وقت فجر سے شروع ہو کر ۱۱ر بجے تک رہتا ہے، پھر ایک گھنٹے کے لیے گھر تشریف لاتے، پھر ظہر کی نماز کے بعد درس شروع ہوتا۔ عصر سے پہلے گھر جاتے۔ عصر اور مغرب کے درمیان مسلم شریف کا درس ہوتا۔ مغرب اور عشاء کا وقفہ کبھی درس اور کبھی گھر پر فتوی نویسی میں گذرتا۔(۵)

تدریس میاں صاحب کو بہت عزیز تھی، لکھتے ہیں: ''تمنائی دارم تا روز مرگ از خدمت کتاب وسنت مرا حرمانے نہ باشد'' تمنا ہے کہ موت کے دن تک کتاب وسنت کی خدمت سے محروم نہ رہوں۔''(۶)

بخاری شریف کئی سو بار پڑھائی۔(۷) موت سے ایک سال یا کم از کم ۱۰ مہینے پہلے صاحب فراش ہو گئے اور تدریس کا کام بند ہو گیا۔ لیکن سالوں بیماری اور شدید عوارض کے باوجود طلبہ کی تدریس جاری رکھی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: ''ایں عاجز بچند امراض مبتلا است لکنہ طوعا وکرھا سبق حدیث بدستور جاری است۔'' یہ خط ۲ر جولائی ۱۹۰۰ء کو مرسل الیہ کو موصول ہوا۔(۸)

---

(۱) مکاتیب نذیریہ، ص: ۴۹، خط نمبر: ۴۰۔ (۲) مکاتیب نذیریہ، ص: ۳۱، خط نمبر: ۲۰۔

(۳) مکاتیب نذیریہ، ص: ۳۹، خط نمبر ۲۹۔

(۴) مکاتیب نذیریہ، ص: ۵۶، اور خط نمبر: ۴۹، ایک اور خط میں بھی ۴۵ر طلبہ کا ذکر ہے، ص: ۶۷، خط نمبر ۶۱۔

(۵) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۲۱۲۔ (۶) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۲۴۶، مکاتیب نذیریہ، ص: ۱۱۹، خط نمبر ۱۱۸۔

(۷) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۸۶۔

(۸) مکاتیب نذیریہ، ص: ۱۲۷، ایک اور خط میں جو اسی زمانے میں لکھا ہوا ہے اپنی مجبوریوں کا ذکر کرتے ہیں کہ مسجد تک ڈولی میں بیٹھ کر جاتے ہیں۔ یہ خط ۳ر مئی ۱۸۹۹ء میں موصول ہوا تھا۔ مکاتیب نذیریہ، ص: ۱۳۴، ۱۳۵۔

مشن:

میاں صاحب شروع میں فقہ حنفی پر عامل تھے۔ بقول نواب قطب الدین دہلوی سید صاحب عدم تقلید کے رجحان کے سخت مخالف تھے۔ اس سلسلہ میں کچھ رسائل بھی تحریر کیے۔ ان کے خیال میں پھر غیر مقلد حضرات خصوصاً عبداللہ صفی پوری اور ان کے اتباع نے سید صاحب کے ساتھ اپنا میل جول بڑھایا اور ان کو اپنے مسلک کی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ (۱)

اس سے بڑھ کر نافہمی کی مثال مشکل ہے۔ مقلدین حضرات کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ سمجھ سکیں کہ دلائل اور براہین کے اعتبار سے کوئی بھی حق پسند اپنا موقف بدل سکتا ہے۔ ابتداء میاں صاحب یقیناً حنفی مذہب کی اتباع کرتے تھے لیکن علم وفکر کی پختگی کے ساتھ ساتھ انہوں نے سوچ سمجھ کر ایک فیصلہ کیا اور پھر اس کی ترویج واشاعت میں لگ گئے۔ میاں صاحب کا سید اسماعیل شہید سے متاثر ہونا، شاہ ولی اللہ کی کتابوں کا بغایت مطالعہ کرنا اور خانوادہ صادقپور سے قریبی تعلق رکھنا، ایسے اسباب تھے جن سے فیصلہ میں مدد ملی۔

احادیث اور تفاسیر اور اسلامی کتابوں کے بغائر مطالعہ کے بعد سید صاحب نے تقلید کا جوا اتار دیا۔ آپ کو یقین ہو گیا کہ اتباع کتاب کو عام کرنا ہی ان کا خاص مشن ہے۔ لکھتے ہیں: "مرا کہ جل شانہ در اشاعت توحید، واذاعت قرآن وحدیث مامور کردہ است، از لوم لائم خوف نیست، دیدہ بینا دارم حاجت عصا و رفیق نیست۔" (۲) کہ اللہ رب العزت نے مجھے توحید، کتاب وسنت کی اشاعت پر مقرر کیا ہے۔ مجھے ملامت کا ڈر نہیں ہے۔ دیدہ بینا رکھتا ہوں، نہ ڈنڈے کی ضرورت ہے اور نہ رفیق کی ضرورت ہے۔

آمین ورفع الیدین وغیرہ اہل حدیث کے امتیازی مسائل تھے۔ میاں صاحب نے اس پر بھی عمل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ سرسید نے میاں صاحب کو اس کی تحریک کی۔ اس میں شک نہیں کہ سید صاحب نے اپنی دانست میں سمجھا ہوگا کہ میاں صاحب نے رفع الیدین وغیرہ ان کی تحریک پر شروع کیا۔ تاہم اس کا سبب میاں صاحب کی اپنی قناعت تھی۔ جس طرح کی بات سرسید سے منقول ہے، اس سے بھی واضح محرک حافظ یوسف صاحب کے ساتھ پیش ہونے والا

(۱) تحفۃ العرب والعجم، ص ۳۰، ایضاً جامع الشواہد، ۴/۲/۲۳ ۔ ۵ ۔ ۱۲۵۔

(۲) مکاتیب نذیریہ، ص ۳۳، مکتوب نمبر: ۵۔

واقعہ ہے۔ مولوی عبدالرب واعظ (میاں صاحب کے سالے) نے جب ان سے کہا کہ آمین بالجہر سنت ہوتا تو میاں نذیر حسین بھی کرتے۔ میاں صاحب کو جب اس کی خبر ہوئی تو کہا اچھا ہم بھی کریں گے۔ (۱)

میاں صاحب کا اعلانیہ اتباع سنت اور پھر اس تحریک قیادت نے ہندوستان میں اس کے فروغ میں بڑا کام کیا یہی ''جرم'' ہے جو مقلدین کو آج بھی سیخ پا کر رہا ہے۔

تدریس کے علاوہ میاں صاحب کی سرگرمیاں:

اللہ تعالیٰ نے میاں صاحب کو گونا گوں صلاحیتوں سے نوازا تھا اور آپ کے وقت میں برکت عطا فرمائی تھی، مشغول تدریسی پروگرام کے ساتھ (الف) دعوت و تبلیغ کے اسفار (ب) اپنے ذہین اور باصلاحیت طلبہ کی تعلیم کے بعد بھی توجیہ اور رہنمائی۔ (ج) فتوی نویسی (د) اہل حدیث عوام اور علما کی دشواریوں کا حل تلاش کرنا اور اس میں قائدانہ رول۔ (ھ) سرحد پار جاری تحریک کی مدد اور اس کے لیے زمین ہموار کرنا (ی) قادیانیت اور دوسری گمراہ تحریکوں کا مقابلہ۔

یہ سارے عناوین بذات خود ایک مستقل مضمون کے مستحق ہیں۔ محض اشارۃً چند باتیں عرض ہیں:

(الف) دعوت و تبلیغ کے لیے میاں صاحب لمبے لمبے اسفار کرتے تھے۔ زیادہ تر یہ سفر بہار اور بنگال کے مختلف خطوں میں ہوتا تھا، آپ کے خطوط میں اس طرح کے کئی اسفار کا ذکر ہے۔ راستہ میں بنارس، الہ آباد، کان پور وغیرہ میں قیام کرتے تھے۔ الحیاۃ بعد المماۃ میں اس طرح کے تین اسفار کا ذکر ہے۔ (۲) اسی طرح کا ایک اور سفر شاہ اسحاق صاحب کی زندگی میں کیا تھا۔ مولانا سیالکوٹی نے پنجاب کے سفر کا تذکرہ کیا ہے۔ (۳) متعدد خطوط میں اپنے تلامذہ اور متعلقین کو اپنے سفر کے پروگرام سے آگاہ کراتے ہیں اور ان کے یہاں پہونچ کر ملاقات کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ (۴)

---

(۱) تاریخ اہل حدیث: ۲/ ۶۱۱-۶۱۲۔

(۲) اسفار کے لیے دیکھیے: الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۸۸۔ شاہ اسحاق کی ہجرت سے پہلے سورج گڑھ کا سفر، ص: ۱۸۰-۱۸۲۔

(۳) تاریخ اہل احدیث، ص: ۴۳۳، یہ سفر ۱۸۹۰ء یا ۱۸۸۹ء کا ہے۔

(۴) مکاتیب بنام محدث ڈیانوی، بنگال کے ایک مہینے کے سفر کے بعد دو دن کے لیے ان کے پاس قیام، ص: ۴۳، خط نمبر: ۳۵۔ اس طرح کے متعدد خطوط دیکھے جاسکتے ہیں، ہمدانی صاحب کو لکھے تھے کہ الہ آباد یا کان پور میں ملیں گے۔

میاں صاحب کے یہ اسفار حکومت وقت کی شدید الجھن کا باعث ہوتے تھے۔ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کے والد کا یہ بیان اسی زمانے میں شائع ہوا تھا کہ میاں صاحب جب بھی دہلی سے باہر نکلتے ہیں تو تمام اضلاع میں چٹھی خانگی حکام کے نام جاری ہوتی ہے۔ کہ مولوی نذیر حسین کہاں جاتے ہیں اور کیا کیا کام کرتے ہیں؟(۱) اس سلسلے میں میاں صاحب کے متعلق سیکرٹ سروس کی کئی رپورٹیں دستیاب ہیں۔ قیام الدین احمد کی کتاب ہندوستان میں وہابی تحریک میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

(ب) اپنے شاگردوں میں باصلاحیات طلبہ کی پوری زندگی رہنمائی فرماتے۔ مولانا عبداللہ غازی پوری کو بخاری کا حاشیہ لکھنے کی ترغیب دی، مولانا ڈیانوی کی شرح ابوداؤد میں بڑی دلچسپی دکھائی۔ ان کی کتاب عون المعبود کے مسودات بھی پڑھتے تھے۔ عبدالعزیز صمدانی کے مختلف مسودات پڑھ کر تصحیح فرمائی۔ مولانا سعید بنارسی کو مخالفانہ تحریر بمقابلہ مولانا بٹالوی لکھنے سے روکتے رہے۔ اس پر آمادہ تھے کہ نواب صاحب اور وہ تحریر کو چھپنے سے پہلے پڑھ لیں۔ یہ ساری باتیں مکاتیب میں مذکور ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے شاگردوں سے مثبت کام لینے میں کس قدر دلچسپی لیتے تھے۔ اسی طرح ان کے اختلافات پر کبیدہ خاطر ہوتے اور تنبیہ کرتے۔ (۲)

(ج) فتوی نویسی کا کام بڑے وسیع پیمانے پر ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں لائق تلامذہ کو مشق کرواتے۔ فتاویٰ نذیریہ ۳ جلدوں میں چھپی ہے اس میں شامل فتاوی آپ کے مجموعی فتاویٰ کا عشر عشیر بھی نہیں۔ آپ کے فتاوی اور اور دوسروں کے فتاوی پر مہر اور دستخط کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔

(د) آپ کے سامنے اہل حدیثوں کو مسجدوں سے نکالنے کی تحریک شروع ہوئی، گندے مسائل کا انتساب کیا گیا، مختلف اہل حدیث علما کے نام سے جھوٹے خطوط بھجوائے گئے۔ دہلی میں ۱۲۹۸ھ میں جب یہ صورت حال پیش آئی تو میاں صاحب نے دانش مندی سے مقابلہ کیا۔ عدالتی کارروائی سے پرہیز کیا تاہم حکام کی کـ نوں کا مثبت جواب دیا اور احناف اور اہل

(۱) بحوالہ تاریخ اہل حدیث: ۲/۱۵۰، ڈاکٹر بہاء۔ ان کا ایک اور بیان ہے کہ میاں صاحب کے آمد کی اطلاع اپنے علاقے میں جاسوسوں کی کثرت اور اہل حدیثوں کی شدید نگرانی سے ہو جاتی ہے، تاریخ اہل حدیث: ۴/۲۱۴۔

(۲) مکاتیب میں عون المعبود کی ابتدا پر خوشی، ص: ۲۹، تکمیل کی دعا، ص: ۳۴، تکمیل کی تمنا، ص: ۲۹، نظر ثانی کا وعدہ، ص: ۳۵، شرح کی بابت استفسار، ص: ۳۵، مولانا سعید بنارسی کو ایک رسالہ برائے جواب بھجوایا، ص: ۹۰، دوسرے خطوط، ص: ۷۶-۷۵، ایضا، ۷۶، ص: ۱۳۱، غازی پوری کے نام، ۳۷، ۱۱۰-۱۱۱ وغیرہ۔

حدیثوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جو ۲۶/ذی القعدہ ۱۲۹۸ھ میں کمشنر نے اپنی نگرانی میں کروایا۔(۱) جامع الشواہد نامی گندی کتاب کا اصل ہدف تو میاں صاحب ہی کی ذات تھی۔ آپ کے تلامذہ نے اس کے علمی جوابات دیے۔ میاں صاحب نے بنارس اور دوسری جگہ قائم مقدمات کی پیروی کا انتظام کروایا۔ اس سلسلے کے متعدد خطوط مکاتیب کے مجموعہ میں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر اہتمام سے ان مقدمات کی جزئیات کا تتبع کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں الہ آباد کی عدالت پیش مقدمہ کے سلسلے میں شیخ عبدالرحیم کو لکھا کہ یہ مقدمہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور مقامی موجودین مالی اعتبار سے کمزور ہیں۔ ان کی فوری مدد کی جائے کہ خدانخواستہ مالی دشواریوں کی وجہ سے مقدمہ ہار جائیں۔(۲)

مولانا سعید بنارسی کو بڑی تفصیل سے لکھا کہ کس طرح اور کہاں کہاں سے ضروری کاغذات مل سکتے ہیں، اس بات پر زور دیا کہ مولانا تلطف حسین کی مدد حاصل کریں کہ وہ ان معاملات سے پوری طرح سے آگاہ ہیں۔(۳)

دوسری طرف علمی انداز میں معیار الحق لکھ کر اصولی طور سے اہل حدیثوں کا موقف مضبوط انداز میں پیش کیا۔ مولانا غازی پوری، مولانا بناری، مولانا رحیم آبادی مولانا بٹالوی وغیرہم نے اس تگ ودو میں حصہ لے کر اہل حدیث کے موقف واضح کیا۔

(ہ) میاں صاحب کے تحریک مجاہدین سے تعلقات کو دھندلا کرنے کے لیے دیوبندے بریلی کا اتحاد سب کو معلوم ہے لیکن حقائق کا انکار حقیقت کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ مولانا عبیداللہ سندھی جیسے متعصب کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ سید صاحب کا تعلق صادق پور کے مجاہدین سے تھا۔

وہابیوں کے خلاف ۵-۱۸۶۴ء میں جو مقدمات قائم ہوئے میاں صاحب کو بھی قید کیا گیا اور راولپنڈی میں لایا گیا۔ ایک سال تک قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں تاہم کوئی واضح ثبوت نہ

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے الکلام المتباہ، ص: ۱۵۸-۱۶۰، مجموعہ رسائل غازی پوری۔

(۲) مکاتیب نذیریہ، ص: ۱۱۱، خط نمبر ۱۰۹۔

(۳) مکاتیب نذیریہ، ص: ۱۰۶-۱۰۷، خط نمبر ۱۰۳- اہل حدیثوں کے خلاف دہلی، میرٹھ، الہ آباد وغیرہ میں بہت سارے مقدمات قائم تھے، بعض کی تفصیل حافظ غازی پوری نے مولانا امرتسری نے فتوحات اہل حدیث میں ذکر کی ہیں، ڈاکٹر بہاؤ الدین نے تاریخ اہل حدیث میں بہت سے مقدمات کی تفصیل ذکر کردی ہیں۔

ملنے پر رہا کرنا پڑتا۔ یہ واقعات انگریزوں سے وفاداری کے الزامات کا بیخ وبن سے صفایا کر دیتے ہیں۔ خود ۱۸۵۷ء کے واقعات کے فوراً بعد آپ کی قید و بند اور محض اتفاق سے پھانسی سے بچ جانا بھی اس الزام کا منہ چڑھاتا ہے۔ حیات النذیر میں اس کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔ اس تحریک کی سرپرستی میاں صاحب کی زندگی کا خاص کارنامہ تھا۔

(ی) جہاں تک شرک و بدعت اور غیر اسلامی رجحانات کے رد کا معاملہ ہے، اس میں میاں صاحب کا رول قائدانہ تھا۔ آپ کے رسائل اور فتاوے اس بات کے واضح ثبوت ہیں۔ مبتدعین آج تک اسی وجہ سے آپ کی ذات کو ہدف بنا رہے ہیں۔ قادیانیت کے فتنے کے کچلنے میں میاں صاحب نے اپنی پیرانہ سالی میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ آپ کا فتویٰ اس متفقہ تاریخی فتویٰ کی بنیاد تھا جس میں ہندوستانی علما نے بالاتفاق مرزا اور اس کے اتباع کی تکفیر کی تھی۔ آپ نے مناظرہ کے لیے دہلی میں مرزا کا چیلنج منظور کیا تو وہ چھپ گیا اور دہلی سے فرار اختیار کر لیا

مرزا غلام احمد میاں صاحب کو اپنا سب سے بڑا مخالف مانتا تھا۔ آپ کو اس امت کا ''ہامان'' قرار دیتا تھا۔ اس کے خیال میں میاں صاحب کی ایک پھونک نے سارے ملک میں آگ لگا دی تھی۔ میاں صاحب کو تکفیر کی بنیاد ڈالنے والا قرار دیا۔ اس کی تفاصیل خود مرزا کی کتابوں میں مذکور ہیں مرزا لکھتا ہے:

''میاں صاحب نے میری باتوں کی طرف کچھ بھی التفات نہ کیا... مجھے کافر ٹھہرایا۔ میاں صاحب کی اس پھونک سے ایک سخت آندھی پیدا ہو گئی اور ہندوستان اور پنجاب کے لوگ ایک سخت فتنہ میں پڑ گئے۔[1] ....انہوں نے سچی گواہی پوشیدہ کر کے لاکھوں دلوں میں جما دیا کہ درحقیقت یہ شخص کافر اور لعنت کے لائق ہے اور دین اسلام سے خارج ہے۔[2]

مرزا اپنی ایک دوسری کتاب میں لکھتا ہے: براہین کے صفحہ ۵۱۰ میں یہ لکھا ہے:

''إذ يمكر بك الذي كفر أوقد لي يا هامان لعلي أطلع إلى إله موسى وإنه لأظنه من الكاذبين، تبت يدا أبي لهب وتب، ما كان له أن يدخل إلا خائفا، وما أصابك فمن الله، الفتنة ههنا، فاصبر كما صبر أولو العزم، ألا إنها فتنة من الله ليحب حبا جما حبا من الله العزيز الأكرم عطاء غير

(۱) روحانی خزائن: ۴/۲۱۲۔ (۲) روحانی خزائن: ۴/۲۱۳۔

مجذوب... اس وقت مجھے یہ سمجھ آیا کہ الہام میں ہامان سے مراد نذیر حسین محدث دہلوی ہے کیوں کہ پہلے سب سے محمد حسین اس کی طرف التجا لے گیا اور یہ کہا کہ أوقد لي يا هامان اس کا یہ مطلب ہے کہ تکفیر کی بنیاد ڈال دے تا دوسرے اس کی پیروی کریں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نذیر حسین کی عاقبت تباہ ہے اگر توبہ کر کے نہ مرے۔ اور ممکن ہے ابولہب سے مراد بھی نذیر حسین ہی ہو۔ (۱)

مزید لکھتا ہے: ''دوسرا فتنہ جو دوسرے درجے پر تھا محمد حسین بٹالوی کی تکفیر کا فتنہ تھا۔ اس میں بھی عوام کا شوروغوغا پادریوں کے شوروغوغا سے کم نہیں تھا۔ اسی فتنہ کی تقریب پر بمقام دہلی سات یا آٹھ ہزار کے قریب مکفر اور مکذب جامع مسجد میں میرے مقابل پر اکٹھا ہوئے تھے، اگر عنایت الٰہی شامل نہ ہوتی تو ایک خطرناک بلوا برپا ہو جاتا۔ غرض اس فتنہ کا بانی محمد حسین بٹالوی تھا اور اس کے ساتھ نذیر حسین دہلوی تھا..... یہ فتنہ بھی پشاور سے لے کر کلکتہ، بمبئی، حیدرآباد اور تمام بلاد پنجاب اور ہندوستان میں پھیل گیا۔''(۲)

یہ اور اس کی دوسری تحریریں میاں صاحب کے قائدانہ کردار کی شاہد ہیں۔

میاں صاحب کا مطالعہ اور کتابوں کے حصول کا ذوق:

بچپن سے کتب بینی کی عادت کا ذکر میاں صاحب نے خود اپنے ایک خط میں کیا ہے۔ یہ سلسلہ ساری زندگی قائم رہا۔ مطالعہ کے ساتھ ساتھ اللہ رب العزت نے مضبوط حافظہ اور اخاذ ذہن عطا فرمایا تھا۔ پرانے مخطوطات کی تلاش اور ان کی خرید کا شدید جذبہ موجود تھا۔ محمد ہواتی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مرا ضرورت خرید کتب پارینہ ہر وقت است۔''(۳) مخطوطات کا اچھا خاصہ ذخیرہ اکٹھا کر لیا تھا۔ (۴) بسا اوقات مولانا ڈیانوی (۵) یا بھوپال سے ضرورت کی کتابیں منگا کر پڑھتے تھے۔ (۶) فاروق فی الحدیث نامی کتاب طلب کی۔ چاہے صمدن میں ملے یا قنوج میں ضرور لائیں۔ (۷)

---

(۱) سراج منیر حاشیہ روحانی خزائن: ۱۳/۳۰-۳۱۔
(۲) کذا ص: ۵۵-۵۶۔
(۳) مکاتیب نذیریہ ص: ۱۰۲، خط نمبر: ۹۸۔
(۴) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۸۱۔
(۵) مکاتیب نذیریہ ص: ۲۳، خط نمبر: ۱۳۔
(۶) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۸۲۔
(۷) مکاتیب نذیریہ ص: ۳۸، خط نمبر: ۳۹۔

سفرِ حج:

سفر حج میاں صاحب کی زندگی کا ایک خاص واقعہ ہے۔ اس کے بغیر آپ کی سوانح حیات مکمل نہیں ہو سکتی۔ میاں صاحب نے ۱۳۰۰ھ میں حج کا قصد کیا۔ اس زمانہ میں مولوی وصی احمد سورتی نے جامع الشواہد لکھی۔ آپ کے ساتھ جو حضرات جانا چاہتے ان کو مطلع کیا گیا۔ بعض حضرات کو شامل سفر ہونے کی رغبت رہی اور سارے خرچ کی ذمہ داری قبول کی۔(1) اس سفر میں آپ کے ساتھ دہلی کے پانچ احباب کا خاص طور سے تذکرہ ملتا ہے۔ مولوی تلطف حسین، محمد احمد، حفیظ اللہ، حاجی قطب الدین اور امام جامع مسجد سید احمد، ڈپٹی امداد اللہ صاحب بھی شریک سفر تھے۔ آپ کے حج کے لیے روانگی کے ساتھ ہی مخالفت کا طوفان شروع ہو جاتا ہے۔ بمبئی میں آپ کا قیام محلہ تاراگھاٹ نمبر ۱۲ میں تھا۔(2) لوگوں نے بمبئی میں جامع الشواہد کی بنا پر مناظرہ کرنا چاہا مگر آپ نے انکار کر دیا۔ حج تو بعافیت گذر گیا۔ آپ نے منیٰ کے قیام کے درمیان وعظ ونصیحت کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ جامع الشواہد کو شکایت بنیاد بنا کر معاملہ اٹھایا گیا۔

حج ختم ہونے کے بعد حاجی امداد اللہ مکی (مولانا نانوتوی اور گنگوہی کے پیر) رحمت اللہ کیرانوی اور دوسرے مخالفین نے ترکی گورنر کے پاس شکایت کی جس کے نتیجہ میں آپ کو تین دن قید میں رکھا گیا۔

میاں صاحب کو اس سفر میں کیا مشکلات پیش آئیں؟ اس وقت کے اخبارات اخبار قیصر الہند اور دوسرے مخالف اخبارات میں برابر شائع ہو رہا تھا۔ اشاعۃ السنۃ، تحفۂ حق میرٹھ، نصرت السنہ وغیرہ میں آپ کے محبین بھی اس موضوع پر لکھ رہے تھے۔ اس سفر میں کیا ہوا، ساری تفاصیل الجھی ہوئی ہیں۔ زیادہ خبریں افواہ کی بنا پر تھیں۔ قتل تک کی خبر چھپ گئی تھی۔ ایک طرف رحمت اللہ کیرانوی مخالفت میں پیش پیش تھے دوسری طرف کہا جا رہا تھا کہ ان کی ضمانت پر مدینہ روانہ ہوئے۔

یہ صحیح ہے کہ ۳ر دن تک آپ کو نظر بند رکھا گیا، تفتیش ہوئی، برٹش کونسل نے مداخلت کی، دوسرے اعیان مکہ نے بھی اپنا رول ادا کیا اور اس طرح آپ کی نہ صرف رہائی ہوئی بلکہ مدینہ کے

---

(۱) مکاتیب نذیریہ، خط بنام مولوی یوسف صاحب، ص: ۱۴۷، خط نمبر: ۱۳۹۔

(۲) مکاتیب نذیریہ، ص: ۱۳۹، خط نمبر: ۱۵۰۔

ترکی حاکم کے پاس پروانہ جاری ہوا کہ آپ کو بحفاظت مدینہ کی زیارت کا موقع دیا جائے۔

میاں صاحب کے مخالفین کا کہنا ہے کہ جامع الشواہد کے مندرجات کو تسلیم کر کے میاں صاحب نے ترک تقلید سے توبہ کر لی، اس بات کو خوب اچھالا گیا۔

میاں صاحب کہتے ہیں کہ مجھ سے کہا گیا کہ تم معتزلی ہو، اعتزال سے توبہ کراو۔ میرا اعتزال سے کوئی تعلق نہ تھا میں نے کہا ہر مسلمان کو اس سے توبہ کرنی چاہیے۔ (۱) نواب صدیق حسن صاحب کے نام اپنے خط میں بھی اس سفر کا تذکرہ ہے اور لکھا کہ نصرت السنہ میں جو کچھ چھپا ہے وہی حقیقت ہے۔ (۲) دراصل آپ کا سفر حج ایک مستقل مقالہ کا مستحق ہے۔

ذریعہ معاش اور سماجی حالات:

دہلی آنے کے بعد میاں صاحب نے درس و تدریس کے علاوہ کوئی اور کام نہیں کیا۔ سماجی طور سے آپ کا شمار دہلی کے بڑے علماء میں ہوتا تھا۔ آپ کی درس گاہ سے بڑی اور کوئی درس گاہ موجود نہیں تھی۔ ہر طرف سے حدیث و تفسیر کی تکمیل کے لیے شائقین علم آرہے تھے۔ خود اہل دہلی آپ کی شخصیت کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ آپ کی مسجد اور گھر کی شہرت ہر طرف ہوگئی تھی۔ بڑی مسجدوں کے اپنے اوقاف اور ذریعہ آمدنی ہوتا تھا، امام اور مدرسین کو تنخواہ ملتی تھی، ہوسکتا ہے مسجد اورنگ آبادی میں اس طرح کا انتظام رہا ہو۔

بظاہر کوئی ذریعہ معاش نہ ہونے کے باوجود میاں صاحب باعزت زندگی گذار رہے تھے۔ رہائش کرایہ کے مکان میں تھی۔ بیٹا میاں شریف حسین اور ان کے بچے، بیٹی اور ان کے شوہر اور بچے سب آپ کے ساتھ رہتے تھے۔ دوست احباب کی پرتکلف دعوت کرتے تھے۔

یہ سب کچھ بقول میاں صاحب "دست غیب" سے مل رہا تھا۔ (۳) کہتے ہیں "بوریہ نشین و کرباس پوش ہشتم... بروزی رسان از بامدا تا بشام می بخشند، تصرف می آید، بروز دیگر چاہ کندن و آب نمودن پیش نظر می باشد۔" (۴) یعنی بوریہ نشین ٹاٹ پہننے والا روزی رساں جو دیتا ہے شام تک صرف ہو جاتا ہے، ہر روز پھر انتظار اور یہی جدوجہد رہتی ہے۔

---

(۱) مکاتیب نذیریہ، ص: ۲۵، خط نمبر: ۲۷۔
(۲) مکاتیب نذیریہ، ص: ۱۵۶، خط نمبر: ۱۵۸۔
(۳) مکاتیب نذیریہ، ص: ۱۱۹، خط نمبر: ۱۱۸۔
(۴) مکاتیب نذیریہ، ص: ۱۴۰، خط نمبر: ۱۳۳۔

بذات خود انتہائی سادہ زندگی گزارتے تھے، سرکہ روٹی عام غذا ہوتی تھی۔ (۱) آپ اپنی ضروریات کا نہ کسی کے سامنے تذکرہ کرتے اور نہ مانگتے تھے۔ آپ کے محبین اور متوسلین خود بخود بطور ہدیہ جو کچھ پیش کر دیتے تھے وہی گزارہ کا ذریعہ تھا۔

وفات:

میاں صاحب کی صحت بتائی جاتی ہے کہ عام طور سے اچھی تھی۔ تاہم بعض خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ قبض اور سردرد کی تکلیف پرانی تھی۔ (۲) بڑھاپے کی وجہ سے کئی عوارض لاحق ہو گئے تھے۔ گھٹنوں میں درد آخری وقت میں شدید ہو گیا تھا، اسی وجہ سے ۱۰ مہینے صاحب فراش رہے۔ ایک آنکھ کی روشنی بھی بالکل ختم ہو چکی تھی۔ سماعت بھی سخت متاثر ہو گئی تھی۔ ضیق النفس کی تکلیف تھی۔ اٹھنے بیٹھنے اور انسانی حوائج میں سخت دقت ہوتی ہے۔ غالباً اس حال میں املا کرایا کہ خوب پڑھا لیا، کتاب اللہ اور سنت نبوی کی خدمت کر لی۔ اب کوئی تمنا اس دنیائے فانی میں باقی نہیں رہی۔ ہاں اللہ جل شانہ کے دربار حق جانے کے لیے فقیر تیار رہے۔"(۳)

اس طرح سو سال کی جدوجہد کے خاتمے کا وقت آ گیا اور ۱۰ رجب ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۳/اکتوبر ۱۹۰۲ء کو مغرب اور عشا کے درمیان اس دنیا سے کوچ کیا۔ دوسرے دن بیٹے سید شریف حسین کی قبر کے قریب اپنی قبر میں اتار دیے گئے۔

رحمه الله رحمة واسعة وتغمده بغفرانه وكرمه۔

---

(۱) احیاۃ بعد الممات، ص: ۱۵۶، ۱۶۷، ۲۳۶۔ (۲) مکاتیب نذیریہ، ص: ۴۳، خط نمبر: ۴۳۔

(۳) مکاتیب نذیریہ، ص: ۱۶۷، خط نمبر: ۱۶۷۔

فصل دوم

حضرت میاں صاحب سید نذیر حسین رحمۃ اللہ علیہ

شاہ اسحاق سے تلمذ

ابن عبدالبر (متوفی ۴۶۳ھ) کا قول ہے: "یستدل علی نباهة الرجل من الماضین بتباین الناس فیه" (۱) حافظ ابن عبدالبر نے اس مختصر جملے میں تجربات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہر بڑے آدمی کے سلسلے میں اختلاف ہوئے ہیں اور یہ اختلافات کمیت اور کیفیت ہر لحاظ سے مختلف فیہ شخصیت کے مرتبہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔

شیخ الکل حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ (م ۱۳۲۰ھ) ایک تاریخ ساز حیثیت کے مالک تھے۔ قدرت نے انہیں جو مرجعیت اور مقبولیت بخشی تھی کسی کو کم ہی ملتی ہے۔" ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء" آپ کی یہ شہرت اور ہر دلعزیزی بہتوں کے لیے موجب قلق بن گئی، الزام، بہتان، تہمت تراشی کا ہر حربہ استعمال کیا جانے لگا، اس طرح آپ کی شخصیت کو داغدار بنانے کی مکروہ کوشش کی گئی، مجبورا میاں صاحب کے نیاز مندوں کو ان ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک کرنا پڑا اور ایک لامتناہی سلسلہ بحث کا دروازہ کھل گیا۔ اس قسم کے تمام ایرادات پراتنی بحث ہو چکی ہے کہ اس میں کوئی ندرت باقی نہیں رہ گئی ہے لیکن تعصب اور تنگ نظری کا برا ہو کہ آج بھی ایسے حضرات مل جاتے ہیں جو انہیں چبائے ہوئے نوالوں پر قناعت کر لیتے ہیں۔

پروفیسر ایوب صاحب قادری کا شمار برصغیر کے بلند پایہ تذکرہ نویسوں میں ہوتا ہے۔ (۲) تراجم کے سلسلے میں موصوف کی معلومات خاصی وسیع ہیں، مگر جماعتی اور گروہی عصبیت موصوف سے کچھ ایسی باتیں کہلواتی ہیں جو ان کے شایان شان نہیں۔

میاں سید نذیر حسین صاحب دہلوی کا تذکرہ کرتے ہوئے قادری صاحب اپنے بعض

---

(۱) الجواهر المضیئة في طبقات الحنفیة: ۲/۲۹۔

(۲) یہ مقالہ اس وقت لکھا گیا تھا جب موصوف حیات تھے۔

نظریات پر سختی سے عمل کرتے ہیں، اب تو یہ عادت سی ہو گئی ہے کہ میاں صاحب کا جب بھی تذکرہ کریں تو شاہ اسحاق (م ۱۲۶۲ھ) سے عدم تلمذ اور انگریزوں سے وفاداری کا مسئلہ وغیرہ ضرور پیش کردیں۔

شاہ اسحاق سے میاں صاحب کا تلمذ نہ ماننے اور میاں صاحب کو انگریزوں کا وفادار ثابت کردینے کی مصلحت یہ بتاتا ہے کہ ہندوستان میں عدم تقلید کا رجحان ولی اللہی مکتبہ فکر سے ماخوذ نہیں اور آزادی کی صبر آزما جدوجہد سے علمائے اہل حدیث بالکل الگ تھلگ تھے، اس طرح دیوبند ولی اللہی مکتب فکر کا مسلمہ امین بن جاتا ہے اور شہیدین کی تحریک جہاد کا سارا کریڈٹ اس طبقہ کو مل جاتا ہے قادری صاحب جس کے ہمنوا ہیں۔

قادری صاحب شیخ الکل کا تذکرہ کس انداز سے کرتے ہیں ہم ''تذکرہ علمائے ہند'' اردو سے میاں صاحب کا ترجمہ نقل کرتے ہیں۔ یہ پورا ترجمہ موصوف ہی کی کاوش کا ثمرہ ہے۔ یہ لکھنے کے بعد کہ (فلاں فلاں اساتذہ سے تحصیل علم کی، لکھتے ہیں: آپ نے اجازت شاہ اسحاق سے حاصل کی) مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی قاری عبدالرحمٰن کا بیان لکھتے ہیں کہ جس روز شاہ اسحاق ہجرت کرکے حجاز روانہ ہوئے تو اس روز نذیر حسین ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند کتابوں کی اول اول ایک ایک حدیث پڑھی اور کل کتابوں کی اجازت حاصل کی۔ شاہ صاحب نے ایک چھوٹے کاغذ پر یہی واقعہ لکھ کر دے دیا۔ اس واقعہ سے پہلے مدرسہ میں پڑھنے کبھی نہیں آئے۔ ۱۸۵۷ء میں ایک انگریز خاتون کو پناہ دی، ساڑھے تین مہینے تک رکھا جس کے بدلے میں ایک ہزار تین سو روپے اور خوشنودی سرکار کا سرٹیفکیٹ ملا۔ جس زمانے میں (۶۵-۱۸۶۴ء) وہابیوں پر مقدمے چل رہے تھے میاں نذیر حسین کو بھی بحیثیت سرگروہ وہابیاں احتیاطاً ایک برس تک راولپنڈی کی جیل میں نظر بند رکھا گیا تھا مگر بقول مؤلف ''الحیاۃ بعد المماۃ'' وفادار گورنمنٹ ثابت ہوئے اور کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا، جب میاں نذیر حسین حج کو گئے تو کمشنر دہلی کا خط ساتھ لے گئے، گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ۲۲ر جون ۱۸۹۷ء کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۰۲ء کو دہلی میں انتقال کیا۔ (۱)

غور فرمایئے کہ اس سارے ترجمے میں قادری صاحب نے بکمال احتیاط صرف انہیں

(۱) تذکرہ علماء ہند اردو، مرتبہ ایوب قادری، ص ۵۹۵، مقالات شروانی، از حبیب الرحمٰن خان شروانی، ص: ۲۸۲، الحیاۃ بعد المماۃ۔

چند چیزوں کا انتخاب کیا ہے جس سے صاحب ترجمہ کی شخصیت مجروح ہو سکے۔ اس پورے ترجمے میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جو آپ کے فضل و کمال اور برصغیر میں اشاعت حدیث کے سلسلے میں آپ کی جدوجہد پر دلالت کرے۔ میاں صاحب کے ساتھ موصوف کا یہی رویہ دوسرے مقامات پر بھی ہے چنانچہ ''کالا پانی'' میں میاں صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(۱) مولوی نذیر حسین بن جواد علی سورج گڑھ ضلع مونگیر (بہار) میں ۱۲۲۰ھ مطابق ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۶ سال کے بعد علم کی طرف میلان ہوا۔ ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ء میں وطن سے پوشیدہ طور پر صادق پور پہونچے وہاں کچھ درسی کتابیں پڑھیں ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۹ء میں دہلی پہونچے، پنجابی کٹرے کی مسجد اورنگ آبادی میں ٹھہرے، مولوی عبدالخالق دہلوی اخوند شیر محمد قندھاری، مولوی جلال الدین ہروی، مولوی کرامت علی بنی اسرائیلی، مولوی محمد بخش، مولوی عبدالقادر رام پوری (م ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۵۴ء) (تلمیذ مفتی شرف الدین رامپوری) سے جملہ علوم حاصل کیے۔ حدیث کی اجازت شاہ محمد اسحاق دہلوی (م ۱۲۶۵ھ مطابق ۶-۱۸۴۵ء) سے حاصل کی۔ (۱)

نواب مولوی حبیب الرحمٰن خان شیروانی عبدالرحمٰن محدث پانی پتی کا بیان لکھتے ہیں کہ "جس روز شاہ محمد اسحاق صاحب ہجرت کر کے حجاز روانہ ہوئے تو اس روز نذیر حسین ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند کتابوں کی اولیت کی ایک ایک حدیث پڑھی اور کل کتابوں کی اجازت حاصل کی۔ شاہ صاحب نے ایک چھوٹے کاغذ پر یہی واقعہ لکھ کر دے دیا، اس سے پہلے مدرسہ میں پڑھنے کو کبھی نہیں آئے۔" (۲)

مولانا سلیمان ندوی نے اس سلسلے میں کچھ قلمی مواد کی نشاندہی کی ہے جو انہیں نواب صدیق حسن خاں (ف ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۸۸۹ء) کے کاغذات میں ملا تھا (۳) ۱۸۵۷ء میں ایک انگریز خاتون کو پناہ دی، ساڑھے تین مہینے گھر میں چھپائے رکھا جس کے بدلے میں ایک ہزار تین سو روپے اور خوشنودی سرکار کا سرٹیفیکٹ ملا۔ جس زمانے میں (۱۸۶۵ء) وہابیوں پر مبہم احیاناً کے نتیجہ میں مقدمے چل رہے تھے تو میاں نذیر حسین کو بھی بحیثیت سرگروہ وہابیاں احتیاطاً

(۱) تواریخ عجیب یعنی کالا پانی، مرتبہ محمد ایوب ایم اے، ص ۲۶۳۔
(۲) ایضاً۔
(۳) حیات شبلی، ص ۲۰۶۔

راولپنڈی جیل میں نظر بند رکھا گیا۔ میاں نذیر حسین کے یہاں سے مختلف حضرات مولوی محمد جعفر تھانیسری (تین خط) مبارک علی ساکن پٹنہ (دو خط) عطاء اللہ (میرٹھ) محمد عثمان (کان پور) امین الدین (کلکتہ) ابو سعید محمد حسین بٹالوی (امرتسری) محمد سوداگر (الموڑہ) کے خطوط برآمد ہوئے، خود میاں صاحب کے خطوط کی نقول ملیں جو مختلف حضرات کو لکھے گئے تھے۔ بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی کے غدر (۱۸۵۷ء) کے دوران میں پانچ فرمان نکلے۔ اس تمام مواد کی بڑے غور و فکر سے تحقیق کی گئی۔ (۱) نتیجہ یہ نکلا کہ میاں صاحب کا جہاد کی تحریک سے کوئی واسطہ نہ تھا اور بقول مؤلف ''الحیاۃ بعد المماۃ'' (سوانح عمری میاں نذیر حسین دہلوی) ''میاں نذیر حسین وفادار گورنمنٹ ٹھہرے اور کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا۔ جب میاں صاحب حج کو تشریف لے گئے تو کمشنر دہلی کا خط ساتھ لے گئے، گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ۱۴ر جون ۱۸۹۷ء کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔'' (۲) میاں نذیر حسین دہلوی عامل بالحدیث عالم تھے، ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی میں میاں صاحب کی شخصیت خاص امتیاز کی مالک رہی ہے، ملک کے مختلف حصوں سے لوگ دہلی پہنچتے اور میاں صاحب سے تحصیل علم کرتے۔ میاں صاحب کے قیام کی وجہ سے ۱۸۵۷ء کے بعد اس میں آمین بالجہر، رفع یدین، آٹھ رکعت تراویح، فاتحہ خلف امام، اور حنفی عامل بالحدیث کے اختلافی مسائل کو خاص طور سے فروغ ہوا۔ میاں صاحب نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب ''معیار الحق'' تصنیف کی۔ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۰۲ء کو دہلی میں میاں نذیر حسین کا انتقال ہوا۔ (۳)

اس طرح اپنے ایک تازہ مضمون میں جو ''معارف'' لاہور میں شائع ہوا ہے قادری صاحب نے اپنی ہی تحقیقات نقل کر دی ہیں۔ تذکرہ علمائے ہند میں شاہ اسحاق کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''الحیاۃ بعد المماۃ (سوانح عمری میاں نذیر حسین) کے مؤلف کا یہ بیان درست نہیں کہ شاہ اسحاق کی ہجرت کے بعد خاندان ولی اللہی کے صدر نشین میاں نذیر حسین ہوئے بلکہ حضرت شاہ اسحاق کے جانشین، ان کے تلمیذ خاص شاہ عبد الغنی مجددی دہلوی تھے جنہوں نے اپنے شیخ کے مسلک کا اتباع کیا اور حجاز کو ہجرت کر گئے اور میاں نذیر حسین نے حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کے

---

(۱) بنگال گورنمنٹ ریکارڈ، ص ۶۵-۷۱۔
(۲) الحیاۃ بعد المماۃ، از فضل حسین۔
(۳) تواریخ عجیب یعنی کالا پانی، ص ۲۶۳۔

مسلک کے خلاف انگریزوں سے خوشنودی کا سرٹیفکیٹ، انعام، اور شمس العلماء کا خطاب حاصل کیا۔" (۱)

قادری صاحب کی ان تمام تحقیقات کو سامنے رکھ کر اگر غیر جانبداری سے غور کیا جائے تو یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ یہ ساری تگ و دو صرف اس لیے ہے کہ خاندان ولی اللہی سے میاں صاحب کا تعلق ختم کر دیا جائے اور اس مکتبہ فکر کا صحیح جانشین دیوبند کو ثابت کر دیا جائے۔ مذکورہ بالا اقتباسات میں صراحت کے ساتھ قادری صاحب نے اس مقصد کو واضح کر دیا ہے۔

قادری صاحب کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ آپ دیوبندی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کے زبردست حامی ہیں، حتی کہ احناف اور اہل حدیثوں کے درمیان نزاعی مسائل میں آپ کی حیثیت ایک جانبدار فریق کی سی ہے۔ افسوس کہ تاریخ نگاری میں بھی ان کی یہ پوزیشن صاف نظر آتی ہے اور آپ بالکل جانبدار بن جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم ایک معاملے کو پیش کرتے ہیں۔

۱۹۶۴ء میں "وصایا اربعہ" کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے، اس میں آپ کی طرف سے ایک طویل معلوماتی مقدمہ بھی شامل ہے، اس مقدمہ میں آپ نے یہ انکشاف کیا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کی طرف بعض کتابوں کا انتساب غلط ہے، اس سلسلے میں اپنا خاص ہدف اہل حدیثوں کو بنایا ہے اور خصوصیت کے ساتھ "البلاغ المبین" اور "تحفة الموحدین" کو جعلی اور وضعی قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے جو دلائل پیش کیے ہیں وہ یہ ہیں:

"طرز تحریر شاہ صاحب کا نہیں" (۲) "کسی سوانح نگار نے ذکر نہیں کیا" (۳) "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاص طور سے ابن تیمیہ کا پروپیگنڈہ مقصود ہے۔" (۴) "کتاب کے شروع میں مصنف کا نام ولی اللہ دہلوی ہے، حالانکہ شاہ صاحب فقیر ولی اللہ لکھتے ہیں" (۵) "یہ نہیں معلوم کہ قلمی نسخہ کہاں سے ملا اور اس کی سند کیا ہے؟"

یہ ہیں وہ دلائل جن کو بنیاد بنا کر موصوف نے ان دونوں رسالوں کو وضعی قرار دیا ہے،

---

(۱) تذکرہ علمائے ہند، ص: ۴۱۰۔
(۲) مجموعہ وصایا اربعہ، مرتبہ محمد ایوب قادری، ص: ۲۸۔
(۳) ایضاً، ص: ۲۹۔
(۴) ایضاً، ص: ۲۸۔
(۵) ایضاً، ص: ۲۸۔

ممکن ہے قادری صاحب کا خیال صحیح ہو یہ کوئی مستبعد بات نہیں مگر اسی مقدمے میں موصوف نواب سعادت یار خان رنگین (م ۱۲۵۱ھ) کے ایک منظوم وصیت نامے کو شاہ صاحب کا آخری وصیت نامہ قرار دیتے ہیں اور پوری قوت سے اپنے اس موقف کی حمایت کرتے ہیں۔ یہاں بھی وہ تمام سوالات موجود ہیں، ان میں سے کسی کا کوئی معقول جواب موجود نہیں۔ خود لکھتے ہیں: "اصل (جسے منظوم کیا گیا ہے) دستیاب نہیں"[1] شاہ صاحب کے کسی سوانح نگار نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے مگر پھر بھی ارشاد ہے کہ یہ شاہ صاحب کی تصنیف ہے اور "البلاغ المبین" ان کی طرف غلط منسوب ہوگئی ہے۔ "البلاغ المبین" کے سلسلے میں قادری صاحب کے اٹھائے ہوئے تمام نکات کا جواب مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف بھوجیانی دے چکے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ وہی فارسی کتاب ہے جو مطبع محمدی لاہور میں مولانا فقیر اللہ لاہوری کے اہتمام سے تقریباً پون صدی قبل شائع ہوئی تھی۔ چند سال ہوئے مکتبہ سلفیہ لاہور نے تحقیق و تعلیق ضمیمہ اور عمدہ طباعت سے آراستہ شائع کیا تھا، اب وہی نسخہ پشاور سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ بعض لوگ شاہ صاحب کی طرف اس کے انتساب میں خواہ مخواہ کا شک پیدا کرتے ہیں حالانکہ انکار کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں۔ کتاب کا موضوع رسومات شرکیہ و بدعیہ کا رد۔ وہی مضمون ہے جو شاہ صاحب کی تقریباً بھی دعوتی قسم کی تصانیف میں موجود ہے جو اس میں تفصیلاً ہے اور غالباً یہی باعث ہوا کہ ماحول میں شدت کی بنا پر ابتدائیہ میں نام کی صراحت نہیں فرمائی گئی کہ حکمت اس کی متقاضی ہوئی جیسا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے "تحفہ اثنا عشریہ" کے ابتدائیہ میں غلام حلیم ابن قطب الدین کا رویہ اختیار فرمایا۔ شاہ صاحب کی تالیفات کے بیان میں "البلاغ المبین" کا ذکر بھی عموماً اسی وجہ سے نہیں ملتا۔ علاوہ ازیں کسی کثیر التصانیف مصنف کی کسی کتاب کا ذکر رہ جانا کیا امکان سے بعید ہے؟ حال ہی میں حافظ ابن القیم کی ایک اہم کتاب "احکام اهل الذمة" دو ضخیم جلدوں میں شام سے طبع ہو کر آئی ہے جس کا دنیا بھر میں ایک ہی مخطوطہ ڈاکٹر حمید اللہ مدظلہ کے خاندان سے دستیاب ہوا ہے۔ اس کا تذکرہ حافظ ابن القیم کی کتاب میں نہیں ملتا، پھر یہ انکار کیا اس سے ملتا جلتا رہ جاتا نہیں کہ کسی ستم ظریف نے "تقویۃ الایمان" کے شاہ اسماعیل کی تصنیف ہی ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ امید ہے "اتحاف النبیہ" کے مخطوطے کی لوح پر "البلاغ المبین" کے تذکرے سے بتوفیقہ

(۱) مجموعہ رسائل اربعہ، ص ۳۲۔

تعالی یہ خلجان رفع ہو سکے گا۔(۱) واللہ یہدی من یشاء إلی صراط مستقیم.

رنگین کے منظوم وصیت نامے کو شاہ صاحب کا آخری وصیت نامہ قرار دیتے ہوئے قادری صاحب نے جو دلائل فراہم کیے ہیں وہ یہ ہیں:

''یہ خیالات وافکار شاہ صاحب کی دوسری تصانیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' وغیرہ میں موجود ہیں۔''(۲)

دوسرے یہ کہ رنگین نے اس کو شاہ صاحب کی طرف منسوب کیا ہے۔ اگر یہ دلائل اس لائق ہیں کہ ان کی بناء پر اس وصیت نامے کو شاہ صاحب کا وصیت نامہ مان لیا جائے تو "البلاغ المبین" اور "تحفۃ الموحدین" تو اس سے بڑھ کر اس بات کی مستحق ہیں کہ انہیں شاہ صاحب کی تصانیف میں شمار کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ مولانا فقیر اللہ مدراسی کا قول نواب رنگین کے مقابلے میں زیادہ قابل اعتناء ہے۔ رہ گئی مضمون کی یکسانیت تو وہ بالکل عیاں ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس مزعومہ وصیت نامے میں ایسی کئی چیزیں موجود ہیں جو قادری صاحب کے اس دعویٰ کو جھٹلا رہی ہیں کہ یہ مضامین شاہ صاحب کی دوسری کتابوں میں دستیاب ہیں۔ ہم ذیل میں چند کی نشاندہی کر رہے ہیں۔

دے اذاں بھی نہ قبر کے اوپر
کوئی دینے لگے تو منع نہ کر (۳)

قادری صاحب بالکل خاموش ہیں اور ضمیمہ میں مطلق اشارہ نہیں کرتے کہ یہ فکر شاہ صاحب کی کس کتاب میں موجود ہے۔ اسی طرح قادری صاحب نے متعدد چیزوں کے بارے میں کہہ دیا ہے کہ اس سلسلے میں کوئی چیز نظر سے نہیں گزری۔ (۴)

شرع میں ہے نکاح کا یہ اصول
مرد وزن کرلیں ہم دگر کو قبول (۵)

اس شعر کے مابعد شاہد اور وکیل کا بیان ہے، ولی کا تذکرہ نہیں، حنفیہ کا مسلک بھی یہی

---

(۱) حاشیہ إتحاف النبیہ، للشاہ ولي اللہ محدث الدھلوي، ص:٦۔

(۲) مجموعہ وصایا اربعہ، ص:۳۲۔

(۳) ایضا، ص:۱۴۰۔

(۴) ایضا، ص:۱۳۳ اور ص:۱۳۷۔

(۵) ایضا، ص:۱۱۳۔

ہے کہ نکاح بلا ولی کے منعقد ہو جاتا ہے مگر شاہ صاحب اس کے برعکس رائے رکھتے ہیں۔'' حجۃ اللہ البالغہ'' میں "لا نكاح إلا بولي" کے تحت فرماتے ہیں:

'' واضح رہے کہ نکاح کے بارے میں تنہا عورتوں کو مختار بنانا ٹھیک نہیں کیوں کہ ان کی عقلیں ناقص رہتی ہیں، اس واسطے ضروری ہے کہ مردوں کا دخل ہو نیز نکاح میں ولی کی شرط مردوں کی عظمت کی دلیل ہے۔ خود قادری صاحب نے بھی یہ عبارت نقل کی ہے مگر اس تضاد پر تنبیہ نہ ہو سکا''۔(۱)

مہر کی انتہا ہے دس ہی درہم
مہر اس سے نہ باندھنا چاہیے کم (۲)

حنفیہ کا یہی خیال ہے مگر شاہ صاحب فرماتے ہیں: '' نبی ﷺ نے اس کی کوئی ایسی حد متعین نہیں کی ہے جس میں کمی بیشی نہ ہو سکے، چنانچہ آپ نے ایک شخص سے کہا کچھ تلاش کر لو خواہ لوہے کی انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو۔''

صرف یہی چند چیزیں نہیں ہیں جو شاہ صاحب کے فکر سے متصادم ہیں بلکہ کتاب میں اس کے اور بھی نمونے بآسانی مل سکتے ہیں۔ ان تمام کے باوجود قادری صاحب کا اصرار ہے کہ اسے شاہ صاحب کا وصیت نامہ مان لیا جائے، اس کی دو وجہیں ہیں:

(۱) اس مزعومہ وصیت نامے میں ایک شعر ہے:

مرا مذہب ہے مذہب حنفی
سب پہ روشن ہے یہ جلی وخفی (۳)

(۲) اس وصیت نامے میں اس کی بھی صراحت موجود ہے کہ عمر کے آخری حصہ میں لکھا گیا ہے۔ شعر

اب مرے دل میں آسمائی ہے یہ
دولت اکسٹھ برس میں پائی ہے یہ (۴)

یہ دونوں باتیں قادری صاحب کے لیے بڑی پرکشش ہیں کیوں کہ اس سے ایک

---

(۱) مجموعہ وصایا اربعہ، ص: ۱۳۵-۱۳۶۔ (۲) ایضاً، ص: ۱۱۳۔
(۳) ایضاً، ص: ۱۰۹۔ (۴) ایضاً، ص: ۱۱۳۔

طرف تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاہ صاحب حنفی المسلک تھے اور دوسری طرف وہ مشہور وصیت نامہ منسوخ ہو جاتا ہے جس میں آپ نے فقہاء کی خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے فتائے محدثین کے اپنے طریقے کو راجح قرار دیا ہے اور اپنی اولاد کو اسی پر کار بند رہنے کی وصیت کی ہے، قادری صاحب کی یہ تمام باتیں صرف مسلک کی دفاع اور اس کی محبت سے معمور ہو کر کرتے ہیں، اس لیے ہم نے ابتداء ہی میں عرض کر دیا ہے کہ موصوف اختلافی مسائل میں ایک جانب دار فریق ہیں۔

ذکر تھا میاں صاحب کا شاہ اسحاق سے تلمذ اور انگریزوں سے ان کی وفاداری کا، مگر بات میں بات پیدا ہوتی گئی اور سلسلہ کلام دراز ہو گیا، اب ہم اصل مسئلہ پر گفتگو کر رہے ہیں۔ حضرت شیخ الکل کا شاہ اسحاق سے تلمذ ایک ایسا مسئلہ ہے جسے نہ صرف قادری صاحب بلکہ احمد رضا بجنوری جیسے دوسرے متعدد حضرات پیش کرتے رہتے ہیں۔

شاہ اسحاق اور میاں صاحب:

یہ بات تو متفق علیہ ہے کہ میاں صاحب ۱۲۴۳ھ میں دہلی پہنچ گئے تھے۔ اسی طرح یہ حقیقت بھی نا قابل انکار ہے کہ شوال ۱۲۵۸ھ تک شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ دہلی میں تھے، ظاہر ہے یہ طویل مدت استفادہ کے لیے بہت کافی ہے، اس مدت میں شاہ اسحاق اور میاں صاحب کا ملنا جلنا بھی طے شدہ ہے، چنانچہ منکرین تلمذ کے معتمد راوی امیر خان صاحب کی روایت میں ہے کہ مہینہ دو مہینہ میں آیا کرتے تھے، قاری عبدالرحمٰن پانی پتی نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔[1] اس طرح میاں نذیر حسین کی شادی کے موقع پر شاہ صاحب کا طالب علموں کے ساتھ حاضر ہونا بھی مشہور بات ہے، لیکن یہ کیسے طے ہو کہ اکتساب اور استفادہ بھی ہے یا نہیں، اس کی تین صورتیں ہیں:

(۱) استاذ کی سند (۲) صاحب معاملہ کا اقرار (۳) معاصرین اور مؤرخین کی شہادت

لیکن قبل اس کے کہ ہم اس معاملے پر ان تینوں طریقوں سے غور کریں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مسلک ولی اللٰہی کا پابند ہونا شاہ اسحاق سے تلمذ پر ہرگز موقوف نہیں کیوں کہ شاہ

---

(۱) الحسد للحساد بحوالہ حسنۃ النبی ترجمہ، ص ۳۱۔ کشف الحجاب کے صفحات ۳۱، ۳۲، ۳۴ اور ۳۵ میں میاں صاحب کے شاہ صاحب کے پاس آنے کا اعتراف ہے۔

صاحب کے افکار کی امین ان کی کتابیں ہیں۔ خاندان کے افراد سے حدیث پڑھے بغیر بھی آدمی ان کی کتابیں حاصل کر کے ان کا پابند ہو سکتا ہے، دوسرے یہ کہ میاں صاحب کی عظمت اس پر ہرگز موقوف نہیں کہ شاہ صاحب سے آپ کا تلمذ ثابت ہو جائے بلکہ آپ کی عظمت کا راز ذاتی قابلیت اور اہلیت ہے۔ تلمذ بالکل اضافی چیز ہے۔ آیئے اب اس مسئلے پر گفتگو کریں۔

استاد کی سند:

مخالفین اور موافقین دونوں کا اتفاق ہے کہ شاہ اسحاق نے میاں صاحب کو سند عطا کی تھی مگر نوعیت میں اختلاف ہے، میاں صاحب کے پاس شاہ صاحب کے دست خاص سے لکھی ہوئی دستخط اور مہر سے مزین جو سند موجود تھی اس کے الفاظ یہ ہیں:

"الحمد لله رب العالمين، والصلوة والسلام على سيد المرسلين، محمد و آله وصحبه أجمعين، أما بعد! فيقول العبد الضعيف محمد إسحاق إن السيد النجيب المولوي محمد نذير حسين قد قرأ علي أطرافا من الصحاح الستة البخاري ومسلم وأبي داود والجامع للترمذي والنسائي وابن ماجه وشيئا من كنز العمال والجامع الصغير وغيرها، وسمع مني الأحاديث الكثيرة، فعليه أن يشتغل بقراء ة هذه الكتب و يتدرس بها لأنه أهلها بالشروط المعتبرة عند أهل الحديث وإني حصلت القراء ة والسماعة والإجازة لهذه الكتب من الشيخ الأجل الشيخ عبدالعزيز المحدث الدهلوي وهو حصل القراء ة والإجازة عن الشيخ ولي الله الدهلوي رحمة الله عليهما وباقي سنده مكتوب عنده حرر في ثاني عشر من شهر شوال ١٢٥٨ من الهجرة والحمد لله أولا و آخرا."

محمد إسحاق
١٢٥٢ھ[1]

یہ سند شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے دست خاص سے لکھی ہوئی ہے، مولانا احمد علی سہارنپوری نے سند دیکھنے کے بعد اس کا اعتراف کیا تھا۔[2]

(۱) الحیاۃ بعد المماۃ، ص:۳۵۔ (۲) ایضاً، ص:۳۹۔

مولانا محمد سعید صاحب بناری (م ۱۳۲۲ھ) کا بیان ہے کہ جامع صغیر کی الگ ایک دوسری سند بھی تھی، اس میں لکھا ہوا تھا: "قرأ علي كلها" (۱)

ظاہر ہے کہ ان دونوں سندوں کی موجودگی میں یہ افسانہ کہ "بوقت ہجرت میاں صاحب کے ایک ایک حدیث پانچ چھ کتابوں کی میاں صاحب کو سنا کر ایک پرچہ پر بطور سند لے لیا تھا" کٹ حجتی اور دروغ گوئی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ کیا "قرأ علي أطرافا" اور "سمع مني أحاديث كثيرة" کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ بس چند کتابوں کی ایک ایک حدیث پڑھ لی ہے اور کیا "قرأ علي كلها" کا مطلب یہ ہے کہ مجھ سے ایک ہی حدیث اس کتاب سے پڑھی ہے؟

گویا اگر ہم اس معاملے پر اس نقطہ نظر سے غور کریں کہ شاہ اسحاق کا بیان کیا ہے تو معاملہ بالکل واضح ہو جاتا ہے اور فیصلہ کی یہی آسان ترین صورت ہے، اس کے بعد بھی اعتراف نہ کرنا تعصب اور تنگ نظری کی بدترین مثال ہے۔

میاں صاحب کا بیان:

اس معاملے میں کسی قطعی رائے تک پہونچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ صاحب کے معاملہ بیان پر غور کر لیا جائے، میاں صاحب کا بیان اس سلسلے میں بالکل واضح ہے فرماتے ہیں:

"در صحیح بخاری بوقت صبح از جناب مولانا محمد اسحاق مرحوم شریک شدم و اکثر سامع بودم وکمتر قاری"، یعنی صحیح بخاری کے درس میں صبح کو شاہ اسحاق کے یہاں حاضر ہوتا تھا۔ ان مجلسوں میں اکثر سامع رہتا تھا اور قاری کم۔ اسی طرح صحیح مسلم کے بارے میں فرماتے ہیں: "در صحیح مسلم ہمی معاملہ رواداد۔" اسی طرح ہدایہ، جامع صغیر اور دوسری کتابوں کے بارے میں میاں صاحب تفصیل کے ساتھ بتاتے ہیں کہ کون سی کتاب کس وقت اور کس کے ساتھ پڑھی۔ رفقاء درس میں مولانا گل محمد پشاوری، مولانا عبداللہ سندھی، مولانا نور علی اور محمد فاضل صاحب کا تذکرہ خصوصیت سے کرتے ہیں۔ یہ پوری داستان خود میاں صاحب کے قلم سے ہے اسے صاحب "الحیاۃ بعد المماۃ" نے پورا کا پورا نقل کر دیا ہے یہ یادداشت (ص ۳۹ سے ۴۱) تک پھیلی ہوئی ہے اس کے

(۱) کشف الحجاب بحوالہ هداية المرتاب، ص: ۳۸

علاوہ ایک اور یادداشت میں لکھتے ہیں:

''واحادیث بسیارے نیز از مولانا حاصل نمودم یا دوازدہ، سیزدہ سال بصحبت مولانا فیض یاب...... دریں از منہ کثیرہ صدہا فتوی اتفاق تحریر اوفتادہ خود مولانا مرحوم بنا بر امتحان و نیز کار گذاری مستفتیاں سوالہا سپردمی فرمودند برائے تحریر جوابات۔''

یعنی میں نے شاہ صاحب سے بہت سی حدیثیں بھی سنی ہیں اور بارہ تیرہ سال تک ان کی صحبت سے فیض یاب رہا..... اس طویل زمانہ میں سیکڑوں فتوے لکھنے کی نوبت آئی خود مولانا مرحوم امتحان کے طور پر اور کارگذاری جانچنے کے لیے بہت سے مستفتیوں کے فتاوے جواب لکھنے کے لیے عنایت کردیا کرتے تھے۔ (۱)

میاں صاحب کے یہ بیانات درحقیقت شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے بیان "قرأ علي أطرافا من الصحاح وسمع مني أحاديث كثيرة" کی شرح وتفسیر ہیں دونوں بیانات بالکل یکساں ہیں۔ ان بیانات کے علاوہ میاں صاحب نے اپنے ہزاروں شاگردوں کی سندوں پر لکھا ہے کہ:

"إني حصلت القراءة والسماعة من الشيخ محمد إسحاق المحدث الدهلوي رحمه الله" ان تمام چیزوں کو سامنے رکھنے کے بعد کسی منصف مزاج کے دل میں شک وشبہ نہیں رہ سکتا۔ جو حضرات اس ثابت شدہ واقعہ کا انکار کرتے ہیں اس کا باعث تعصب کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں۔ ایک ذمہ دار صادق القول عالم دین برابر اس چیز کا اعلان کر رہا ہے کہ میں نے فلاں استاد سے فلاں کتاب اس وقت پڑھی، میرے رفقائے درس یہ حضرات تھے اور اس کے استاد کا قول بھی اس کی تائید کر رہا ہے پھر بھی یہ حضرات آنکھ بند کر کے اس کا انکار کر رہے ہیں۔ ان کا ضمیر بھی انہیں ملامت نہیں کرتا۔

دوسروں کی شہادتیں:

اب ہم معاصرین کی شہادت کے اعتبار سے اس معاملے پر غور کریں گے۔ یہاں ہمیں انکار و اقرار دونوں پہلو زیر بحث لانے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ پہلے منکرین کے بیانات پر بحث کریں۔ پروفیسر قادری صاحب نے قاری عبدالرحمٰن پانی پتی سے جو روایت نقل کی ہے ہم نے

---

(۱) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۳۹-۴۱۔

انہی کے الفاظ میں ذکر کر دیا ہے۔ انہیں بیانات کو مولانا احمد رضا بجنوری نے اپنے حاشیوں کے ساتھ ''انوارالباری جلد دوم'' میں نقل کیا ہے۔ پھر مولانا عبدالغنی مجددی کے تذکرے میں اسی طرح کی ایک دوسری روایت بھی ذکر کی ہے۔ یہ روایت ''ارواح ثلاثہ'' کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے۔ اس کے راوی امیر خاں نے مولانا عبدالقیوم بڈھانوی سے نقل کیا ہے کہ ''جس روز شاہ صاحب حجاز جا رہے تھے میاں نذیر حسین حاضر ہوئے تو نواب قطب الدین صاحب (جن سے اس وقت میاں نذیر حسین کی دوستی تھی) کی سفارش پر حضرت نے ان سے تمام کتابوں سے ایک ایک حدیث پڑھائی اور اجازت دے دی۔''(۱) اس روایت کو نقل کر کے صاحب انوار لکھتے ہیں: ''بظاہر یہ روایت ثقات سے مروی ہے''۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی (م۱۹۴۴) اس روایت پر بطور حاشیہ لکھتے ہیں: ''ایسی سند سند برکت ہے اجازت نہیں''۔(۲)

یہی وہ دونوں روایتیں ہیں جن پر ان حضرات کا سارا دارومدار ہے اس لیے ہم تفصیل سے ان دونوں کی قدر و قیمت واضح کرنا چاہتے ہیں۔

قاری عبدالرحمٰن پانی پتی اور ان کی روایت:

حقیقت یہ ہے کہ اس افسوس ناک جواب اور جواب الجواب کے سلسلے کے بانی قاری صاحب ہی ہیں۔ موصوف نے اس نظریہ کی تبلیغ کو اپنی ایک اہم ذمہ داری قرار دے رکھا تھا، جگہ جگہ جا کر شد و مد کے ساتھ اعلان کرتے اور اس پر بحث و مباحثہ کے لیے لوگوں کو للکارتے تھے۔ مولانا محمد سعید بنارسی (م۱۳۲۲ھ) لکھتے ہیں کہ ''قاری صاحب ایک مرتبہ بنارس تشریف لائے اور اس نظریہ کی تبلیغ شروع کی تو افسوس ناک صورت حال پیدا ہوگئی۔''(۳)

پانی پتی صاحب نے اپنی تصنیف ''کشف الحجاب'' میں اس مسئلے کا ذکر نہایت درشت انداز میں کیا ہے، لکھتے ہیں کہ: ''کبھی مسئلہ پوچھنے کو یا کوئی لفظ ''جلالین'' کا پوچھنے کو آجاتے تھے، خدمت میں جناب مولانا اسحاق قدس سرہ کے بوقت ہجرت میاں صاحب ایک ایک حدیث پانچ کتابوں سے شاہ اسحاق کو سنا کر ایک پرچہ پر بطور سند کے لے لیا اور محدث بن بیٹھے۔''(۴) اس مسئلہ سے موصوف کو کچھ ایسا شغف تھا کہ ملاقاتیوں تک سے اس کا تذکرہ کرتے رہتے، چنانچہ

(۱) انوارالباری: ۲/۲۱۷۔ (۲) ارواح ثلاثہ، ص: ۱۲۰۔
(۳) هداية المرتاب برد ما في كشف الحجاب، ص: ۳۔ (۴) ایضاً ص: ۳۷۔

مولانا شروانی سے ایک انتہائی سرسری ملاقات میں اس مسئلہ کا تذکرہ کیا تھا،(۱) لیکن یہ سوال کہ موصوف نے یہ روش کیوں اپنائی اب بھی جواب طلب ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس کے مختلف عوامل موجود ہیں۔

صاحب ''الحیاۃ بعد المماۃ'' لکھتے ہیں:

''شاہ اسحاق صاحب نے ایک بار طلبہ سے پوچھا کہ "إذا" مفاجات کے لیے ہے۔ طلبہ جواب دے ہی رہے تھے کہ قاری صاحب بول اٹھے کہ "إذا" مفاجات کے لیے آتا ہے؟ میاں صاحب نے مذاقاً کہا ''یک نہ شد دو شد'' قاری صاحب اس واقعہ سے ایسے برہم ہوئے کہ پھر بھلا نہ سکے۔''(۲)

طالب علمی کا یہی واقعہ کیا کم تھا کہ موصوف کی نواب باندہ کے یہاں ملازمت کے زمانہ میں ایک اور واقعہ پیش آگیا۔ واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ نواب صاحب کے یہاں قاری صاحب سے سینئر ایک دوسرے قاری موجود تھے، انہیں لوگ قاری فیض کے نام سے جانتے تھے۔ قاری فیض کم علم اور نابینا تھے لیکن ان کی تنخواہ پانی پتی صاحب سے زیادہ تھی۔ قاری پانی پتی صاحب اس صورت حال پر سخت جھنجھلائے۔ اپنی اہمیت جتلانے کے لیے ایک کاغذ پر قرأت کے متعلق پچیس سوالات لکھ کر لائے اور نواب صاحب سے کہا کہ قاری فیض صاحب سے اس کا جواب دلا دیجیے۔ نواب صاحب نے یہ رقعہ قاری فیض کے حوالے کر دیا، اس کے بعد قاری فیض نواب صاحب کے ہمراہ بنارس آگئے۔ اتفاق کی بات کہ انہی دنوں میاں صاحب بھی بنارس تشریف لائے تھے۔ قاری فیض صاحب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور میاں صاحب سے ان سوالات کا جواب لکھنے کی فرمائش کی۔ جواب لکھ کر میاں صاحب نے پوچھا یہ سوالات کس نے دیے ہیں؟ یہ بتلانے پر کہ پانی پتی کے سوالات ہیں میاں صاحب نے فرمایا ہمارا پرانا یار ہے مگر بڑا غصہ ور، اس کو نہ معلوم ہو ورنہ بگڑ جائے گا لیکن قاری صاحب کو اس واقعہ کا علم ہو گیا تو سخت برہم ہوئے۔''(۳)

یہ دونوں واقعات حقیقتاً انتہائی معمولی اور غیر اہم ہیں مگر قاری پانی پتی کی طبیعت سے جو

---

(۱) مقالات شروانی۔ (۲) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۵۱۔

(۳) ایضاً، ص: ۱۵۵۔

لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کے لیے یہ واقعات ہی بڑے اہم تھے، صرف مذکورہ بالا واقعہ ہی پانی پتی صاحب کی حاسدانہ طبیعت کا بذات خود آئینہ دار ہے، تاہم آیئے قاری صاحب کی مزاجی کیفیت سے متعلق چند مزید باتیں عرض کردوں۔ یہ بات تو بہت مشہور ہے کہ قاری پانی پتی صاحب بڑے غصہ ور آدمی تھے، مولانا سعید صاحب بناری لکھتے ہیں کہ: "قاری صاحب سخت غصہ ور آدمی تھے۔"(۱) ڈپٹی امداد العلی اکبرآبادی نے بھی قاری صاحب کی حدت مزاجی کا ذکر کیا ہے۔ صاحب "الحیاۃ بعد المماۃ" لکھتے ہیں: "قاری صاحب شدید الغیظ آدمی تھے"(۲) چند سطر قبل ہی میاں صاحب کا بھی ایک ریمارک گذر چکا ہے۔ مولانا احمد علی بجنوری ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میرے ایک استاد سند لکھوانے حضرت (پانی پتی) کے پاس گئے، کلک موجود نہیں تھا، فاؤنٹین پین دے دیا تو ہاتھ سے جھٹک دیا اور فرمایا کہ تم لوگوں میں نیچریت سرایت کرگئی ہے۔"(۳)

درحقیقت پانی پتی صاحب کی یہ مزاجی کیفیت ایسی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی کہ جس کا ذکر الفاظ میں ناممکن ہے۔ ایک واقعہ سے اس کا اندازہ لگایئے "آپ کے ایک شاگرد حنیف آروی کا بیان ہے کہ ایک بار قاری صاحب کچھ لکھ رہے تھے، ایک رومال دھوپ میں خشک ہونے کے لیے پھیلائے ہوئے تھے، رومال اتفاقاً اڑ گیا تو درست کردیا، پھر اڑا پھر ٹھیک کردیا، تیسری بار جب پھر ایسے ہی ہوا تو قاری صاحب سخت برہم ہوئے اور اٹھ کر رومال کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا اس کے بعد جوتوں سے ان ٹکڑوں کی پٹائی شروع کری ساتھ ہی بلند آواز سے یہ بھی کہتے جاتے پھر اڑ، پھر اڑ۔"(۴)

ظاہر بات ہے حدت مزاجی اور جوش غضب سے مغلوب طبیعت والا انسان ان مذکورہ بالا واقعات کا کیسے تحمل کرسکتا ہے۔ میاں صاحب سے قاری صاحب کی عدوات اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ میاں صاحب کے بڑھ کر ملنے کے باوجود قاری صاحب ان کی طرف ملتفت نہ ہوئے۔ اب آپ خود فیصلہ کیجیے کہ اس پس منظر میں پانی پتی صاحب کے قول پر غور کرنا کیا کوئی معقول بات ہے۔ معاصرت ہی کیا کم تھی کہ اس کے ساتھ ساتھ عداوت بھی جمع ہوگئی، ایسی صورت

---

(۱) کشف الحجاب۔ (۲) الحیاۃ بعد المماۃ، ص:۵۱۔

(۳) انوار الباری۔ (۴) ہدیۃ المرتاب، ص:۶۔

میں اگر امام مالک جیسے جلیل القدر امام کا قول قابل استناد نہیں قرار دیا جا سکتا تو یہ بانی جماعت کس شمار وقطار میں ہیں۔ خطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ) لکھتے ہیں:

"إن مالكا عابه جماعة من أهل العلم في زمانه بإطلاق لسانه في قوم معروفين بالصلاح والإنابة والثقة والأمانة"[1] یعنی امام مالک پر بہت سے اہل علم نے ان کے زمانے میں اس بات پر سخت نکیر کی ہے کہ انہوں نے بہت سے صالح ، ثقہ اور امین لوگوں پر جرحیں کی ہیں۔

روایت ارواح ثلاثہ:

اب رہ گئی "ارواح ثلاثہ" کی روایت، اس سلسلے میں ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ روایت بالکل خانہ زاد ہے، ہمارے پاس اس کے جعلی اور وضعی ہونے کے متعدد شواہد موجود ہیں۔ سردست انہی چند اشارے پر اکتفا کر رہے ہیں، اس روایت کا ماحصل صرف اتنا ہے کہ "میاں صاحب کو شاہ صاحب سے تلمذ حاصل نہیں، سند صرف اس کی دی گئی تھی کہ مجھ سے آج چند حدیثیں پڑھی ہیں" مگر ہم نے شاہ صاحب کے دست خاص کی لکھی ہوئی جو سند پیش کی ہے اس کے الفاظ بانگ دہل اعلان کر رہے ہیں کہ یہ افسانہ بالکل فرضی ہے۔ شاہ صاحب کے الفاظ ہیں "سمع مني الأحاديث الكثيرة" اور "قرأ علي أطرافا من الصحاح" کیا یہ الفاظ بھی بتا رہے ہیں کہ واقعہ کی صورت وہی ہے جو یہ حضرات بتا رہے ہیں۔ کیا ایک ہی مجلس میں تھوڑی دیر کے اندر احادیث کثیرہ کا سماع ممکن بھی ہے؟ ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کے قول کے مقابل میں کسی کی بات ہرگز لائق اعتناء نہیں بن سکتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس روایت کے راوی امیر خاں صاحب دیوبندی حلقے میں خواہ کسی بھی حیثیت سے جانے پہچانے جائیں مگر عام اہل علم کی نظر میں ایک قصہ گو سے زیادہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "ارواح ثلاثہ" کی متعدد روایات کو اہل علم نے جعلی قرار دیا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر صاحب (م ۱۹۷۱ء) اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"اس میں سید صاحب شاہ اسماعیل اور بعض دوسرے بزرگوں کے متعلق حکایات ہیں

---

(۱) تاریخ بغداد ۱/۲۲۳۔

لیکن بعض حکایات بداہتاً غلط ہیں مثلاً حکایت ۵۴، ۵۵، ۹۱، ۱۱۰، ۱۲۱ ۔"(۱)

مولانا مسعود عالم ندوی (م ۱۹۵۴ء) نے بھی ایسی ہی رائے ظاہر کی ہے۔اس لیے نمو جب ہے ایسی اہم بحث میں داستان سرایوں کی شہادت ہرگز قابل قبول اور لائق اعتنا نہیں ہو سکتی۔

تیسری بات یہ ہے کہ اس روایت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ "بغیر پڑھے سند نواب قطب الدین صاحب کی سفارش پر ملی تھی۔" مگر خود نواب صاحب اس کے برخلاف تلمذ کا بصراحت اعتراف کرتے ہیں۔علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں میاں صاحب کی وفات کے بعد ایک مضمون شائع ہوا تھا جو انسٹیٹیوٹ گزٹ کے ایڈیٹر کا تھا۔صاحب مضمون نے لکھا ہے:

"اس میں شک نہیں کہ آپ کو شاہ (اسحاق) صاحب کی خدمت میں تلمذ حاصل ہے، چنانچہ مولانا قطب الدین نے اپنی کسی تصنیف میں اس کی تصریح کی ہے۔"(۲)

نواب قطب الدین صاحب کے اس اعتراف کے بعد اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس روایت کی آبرو ہی کیا رہ گئی؟

یہ ہے ان دونوں روایتوں کی حقیقت جن کی بنا پر دیوبندی مکتب فکر کے تنگ نظر علما میاں صاحب کی عالمانہ شان پر بٹہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔اب ہم ذیل میں چند ایسے افراد کا تذکرہ کریں گے جنہوں نے حق وانصاف کو ملحوظ رکھ کر حقائق کا اعتراف کیا ہے۔

مثبتین

آنکھ بند کر کے حقائق کا انکار بڑے دل گردے کا کام ہے،اس لیے اکثر انصاف پسند قادری اور قاری صاحب کی روش کو غلط قرار دیا ہے۔ہم ذیل میں چند اہم حضرات کی شہادتیں نقل کر رہے ہیں۔

مولانا محمد تھانوی (م ۱۲۹۶ھ)

مولانا موصوف دیوبندی مکتب فکر کے بلند پایہ عالم ہیں۔اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ہر روز الانادراً حاضر خدمت عالی حضرت استاذی مولانا ممدوح می شدند وحل مشکلات حدیث شریف وتفسیر وفقہ وغیرہ بخوبی می کردند......وتوجہ خاطر حضرت مولانا محمد اسحٰق

(۱) سید احمد شہید ۱/۲۴۱۔ (۲) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۳/۱۰/اکتوبر ۱۹۰۲ء۔

قدس سرہ جناب مولوی نذیر حسین از بس بودہ است بوقت رونق افروزی حرمین شریفین بتقریب ہجرت مسموع است کہ برآں یقین است سند حوالہ مولوی سید نذیر حسین صاحب عطا فرمودہ اندو مجاز گردانیدہ۔ فقط بجہت "ولا تکتموا الشھادۃ" ہر چہ معلوم مخاص بود بے کم وکاست وانمود ..... برقول اہل عناد گوش نباید نہاد سد راہ فیض است کہ از اوشاں جاری است بر قدر کہ نو آموزاں برآں نازمی کنند زیادہ ازاں مولوی صاحب موصوف در ذخیرہ خویش نہادہ فراموش کردہ باشند"۔(۱)

یعنی استاد محترم کی خدمت میں روزانہ برابر حاضر ہوتے تھے اور حدیث، تفسیر، فقہ کی مشکلات کا حل طلب کرتے۔ مولانا محمد اسحاق صاحب قدس سرہ کی توجہ مولوی نذیر حسین کی طرف بہت زیادہ تھی، سنا ہے اور اس پر یقین بھی ہے کہ (مولانا اسحاق) جس وقت حرمین کی طرف ہجرت کرنے والے تھے آپ کو سند دی اور اپنا مجاز بنایا۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے "لا تکتموا الشھادۃ" فرمان خداوندی کی رعایت کرتے ہوئے بے کم وکاست بیان کر دیا۔ اہل جہل وعناد کی بات نہیں سننی چاہیے کہ اس میں اس فیض کے بند ہو جانے کا اندیشہ ہے جو مولانا موصوف سے جاری ہے۔ اتنی مقدار (علم وفضل) کہ جس پر نو آموزوں کو ناز ہوتا ہے مولانا موصوف نے حاصل کر کے فراموش کر دیا۔"

مولانا احمد علی سہارن پوری (محشی بخاری):

مولانا احمد علی سہارن پوری بھی ابتدا میں اس کا انکار کرتے تھے کہ میاں صاحب کو شاہ صاحب کی جناب میں تلمذ حاصل ہے، چنانچہ اس بارے میں ان سے اور میاں صاحب سے کئی مرتبہ گفتگو ہوئی۔ جب مولانا موصوف کو یقین ہو گیا کہ میاں صاحب کو تلمذ حاصل ہے تو علی الاعلان اس کا اقرار کر لیا۔ فضل حسین مظفر پوری نے مولانا سہارنپوری اور میاں صاحب کے درمیان اس موضوع پر ہونے والی ایک گفتگو کی روداد یوں نقل کی ہے کہ میاں صاحب نے پوچھا کہ تم شاہ اسحاق کا خط پہچانتے ہو؟ انہوں نے کہا خوب پہچانتا ہوں۔ میاں صاحب نے اپنی سند سامنے رکھ دی اور کہا کہ کہو یہ کس کا حرف ہے؟ انہوں نے کہا کہ شاہ محمد اسحاق صاحب کا۔ پھر پوچھا کہ مہر کس کی ہے؟ مولوی احمد علی صاحب نے کہا کہ شاہ اسحاق صاحب کی۔ (۲)

(۱) الحیاۃ بعد المماۃ، ص:۳۴۔

(۲) الحیاۃ بعد المماۃ، ص:۴۹۔

غالباً انہیں مناقشات کی وجہ سے مولانا سہارن پوری کی رائے بدل گئی اور انہوں نے متعدد طریقے سے میاں صاحب کے تلمذ کا اقرار کیا۔ ایک اعلان عام میں لکھتے ہیں:

"صحبت وزیارت وحاضر باشی مولوی صاحب ممدوح بہ حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ چوں شمس نصف النہار ہویدہ است تخمیناً پانزدہ سال مولوی صاحب موصوف وحضرت مولانا در شہر دہلی بودند پس اشتباہ عدم صحبت وزیارت بے اصل است۔ واما اشتباہ اسناد کتب احادیث پس چوں اسناد دستخطی حضرت مولانا ممدوح بدست مولوی صاحب موجود است محل اشتباہ نیز باقی نماندہ۔"

(محررہ پانزدہم ربیع الاول ۱۲۹۲ھ) (۱)

یعنی مولوی صاحب کی صحبت اور زیارت نیز ہر وقت مولانا نور اللہ مرقدہ کے پاس موجود رہنا یہ سب باتیں دوپہر کے سورج کی طرح واضح ہیں۔ تخمیناً پندرہ سال تک مولوی (نذیر حسین) صاحب اور مولانا اسحٰق صاحب ایک ساتھ دہلی میں رہے ہیں اس لیے عدم صحبت وزیارت کا شبہ کرنا بے سود ہے۔ رہا حدیث کی کتابوں کی سند کے بارے میں شبہ کرنا تو جب مولانا ممدوح کے دستخط کے ساتھ ایک سند مولوی صاحب کے پاس موجود ہے، تو اس بارے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔

یہ دونوں شہادتیں نیاز مندوں کی نہیں مخالف مکتبہ فکر کے نمائندوں کی ہیں اس لیے میرے نزدیک ان کی شہادتوں کے بعد انکار کی گنجائش ہی نہیں باقی رہ جاتی پھر بھی ہم مزید چند بلند پایہ افراد کی شہادتیں نقل کر رہے ہیں۔

رحمان علی (مؤلف "تذکرہ علمائے ہند"):

"تذکرہ علمائے ہند" میں مولوی شبلی جونپوری (م ۱۲۸۶ھ) کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "واجازت کتب احادیث از مولوی سید نذیر حسین تلمیذ مولانا محمد اسحاق دہلوی یافتہ بحصول سند ممتاز گشت"۔ (۲)

ہم قادری صاحب سے (جنہوں نے اس کتاب کے ترجمہ وترتیب میں بڑی محنت کی ہے) دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ آخر میاں صاحب کی وہ کون سی حدیث کی سند تھی جس کی تحصیل

---

(۱) احیاۃ بعد المماۃ، ص: ۴۷۔ (۲) تذکرہ علمائے ہند، از رحمان علی صاحب، ص: ۱۹۳، مطبع منشی نول کشور لکھنؤ۔

باعث امتیاز ہوا کرتی تھی؟ ناظرین ملاحظہ فرمار ہے ہیں کہ رحمان علی صاحب (جنہوں نے میاں صاحب کا تذکرہ بھی اپنی کتاب میں کرنے سے اجتناب کیا ہے) کس قدر صراحت کے ساتھ شاہ اسحاق سے میاں صاحب کے تلمذ کی تصریح کرر ہے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہیں بھی میاں صاحب کی شاگردی اور حصول سند واجازت کا اعتراف ہے۔

نواب صدیق حسن خاں بھوپالی (م ۱۳۰۷):

نواب صاحب اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں" درہمیں سال (ستۃ الف واثنین وتسع واربعین) حدیث شریف از مولانا محمد اسحٰق صاحب مرحوم ومغفور شروع فرمودند صحیح بخاری وصحیح مسلم بشراکت مولوی گل محمد کابلی ومولوی عبداللہ سندھی ومولوی نوراللہ سروانی وحافظ محمد فاضل سورتی وغیرھم حرفاحرفا خواندند وہدایہ وجامع صغیر بمعیت مولوی بہاء الدین دکھنی وجدامجد قاضی محفوظ اللہ صاحب پانی پتی ونواب قطب الدین دہلوی وقاری اکرام اللہ وغیرہم وکنز العمال ملا علی متقی علاحدہ شروع فرمودند دووسہ جز بخواندند وسنن ابی داؤد وجامع ترمذی ونسائی وابن ماجہ وموطا امام مالک بتمامہا بر مولانا ممدوح عرض نمودند واجازہ از شیخ الآفاق حاصل نمودہ۔"(۱)

یعنی ۱۲۴۹ھ میں مولانا محمد اسحٰق مرحوم سے حدیث شروع کی۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم مولوی گل محمد کابلی ومولوی عبداللہ سندھی وغیرہ کے ساتھ حرفاحرفا پڑھی۔ ہدایہ اور جامع صغیر مولوی بہاء الدین دکنی اور جدامجد قاضی محفوظ اللہ صاحب پانی پتی اور نواب قطب الدین دہلوی نیز قاضی اکرام اللہ وغیرہ کے ساتھ پڑھی۔ کنز العمال الگ شروع کی اور دوتین اجزاء پڑھے، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، ابن ماجہ، موطا امام مالک بھی مولانا کے سامنے پڑھیں اور اجازت شیخ الآفاق (مولانا اسحاق صاحب محدث دہلوی) سے حاصل کی۔

مولانا شمس الحق ڈیانوی (م ۱۳۲۹ھ):

مولانا ڈیانوی مرحوم غایۃ المقصود کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

(۱) حیات شبلی ص: ۴۵، ص: ۴۶۔ میاں فضل حسین صاحب مظفر پوری لکھتے ہیں:" پھر ابجد العلوم وغیرہ نوابی تالیفات میں میاں صاحب کا ترجمہ یا تذکرہ نہ لکھنا کیا تعجب خیز نہیں ہے؟ افسوس ہے کہ نواب صاحب مرحوم نے ابن خلکان پر اعتراض کرتے وقت اس مثل کو پیش نظر نہیں رکھا:" پہلے اپنی آنکھ کا شہتیر نکال تب دوسرے کی آنکھ کے تل کو دیکھ" (الحیاۃ بعد المماۃ) یہ بربنی محض عدم اطلاع کی وجہ سے ہے۔

"واشتغل بعد ذلك العلوم الدينية من التفاسير والأحاديث عن الشيخ الأجل الأكمل محدث الدهر أبي سليمان محمد إسحاق الدهلوي المتوفى سنة اثنتين وستين بعد الألف ومأتين ابن محمد أفضل الفاروقي العمري وسبط الشيخ العلامة عبد العزيز بن ولي الله الدهلوي، فقرأ عليه الصحاح الستة بالضبط والإتقان والبحث والتدقيق وكنز العمال والجامع الصغير للحافظ السيوطي، وصحب العلامة ثلاثة عشر سنة واستفاض منه فيوضا كثيرا، وأخذ عنه ما لم يأخذ أحد من تلامذته فبلغ مراتب الكمال وصار خليفة له.........وحصل له منه الإجازة في شوال سنة ثمان وخمسين بعد الألف والمأتين." (١)

یعنی اس کے بعد علوم دینیہ تفسیر اور حدیث کا اکتساب مولانا محمد اسحٰق دہلوی سے کیا۔صحاح ستہ ضبط واتقان کے ساتھ پڑھی۔ کنز العمال اور جامع صغیر للسیوطی بھی پڑھی۔ تیرہ سال آپ کی صحبت سے فیض یاب ہوئے اور ایسا علم حاصل کیا جو دوسرے تلامذۃ نہیں حاصل کر سکے۔ اس طرح کمال کے درجے تک پہنچ گئے اور آپ کے خلیفہ ہوئے۔ ۱۲۵۸ھ میں آپ نے اجازت حاصل کی۔

سید سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ء):

سید صاحب نے اپنی متعدد تحریروں میں شاہ اسحٰق سے میاں صاحب کے تلمذ کا اقرار کیا ہے، حیات شبلی میں لکھتے ہیں:

"شاہ اسحٰق صاحب کے ایک دوسرے شاگرد سید نذیر حسین بہاری دہلوی ہیں اس دوسرے سلسلے میں توحید خالص اور رد بدعت کے ساتھ فقہ حنفی کے بجائے براہ راست کتب حدیث سے بقدر فہم استفادہ اور اس کے مطابق عمل کا جذبہ نمایاں ہوا۔" (۲)

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ایک فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں" مولانا سید نذیر حسین صاحب کی مولانا شاہ اسحٰق صاحب سے شاگردی کا مسئلہ بھی اہل حدیث واحناف میں مابہ النزاع بن گیا ہے، احناف انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو شاہ صاحب سے بے پڑھے

---

(۱) ابجد العلوم، ص ۱۱۔ (۲) حیات شبلی، ص: ۴۵-۴۶۔

صرف تبرکاً اجازہ حاصل ہے اور اہل حدیث ان کو حضرت شاہ اسحاق صاحب کا باقاعدہ شاگرد بتاتے ہیں۔ مجھے نواب صدیق حسن صاحب کے مسودات میں مولانا نذیر حسین کے حالات کا مسودہ ملا جس میں بتصریح مذکور ہے کہ ۱۲۴۹ھ میں شاہ صاحب کے درس حدیث میں وہ داخل ہوئے (پھر نواب صاحب کی پوری عبارت نقل کر کے لکھتے ہیں) البتہ شاہ صاحب سے سند اجازۃ انہوں نے تحریری طور پر ۲ر شوال ۱۲۵۸ھ کو حاصل کی جب شاہ صاحب ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز جا رہے تھے۔(۱)

مولانا محمد ادریس صاحب نگرامی (م ۱۳۳۰ھ):

مولانا نگرامی مرحوم نے "تذکرہ علمائے حال" میں شاہ اسحاق صاحب سے میاں صاحب کے تلمذ کا اعتراف کیا ہے، چنانچہ میاں صاحب کے اساتذہ کا تذکرہ کرتے ہوئے شاہ اسحاق صاحب کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"آپ کے شیوخ کے نام یہ ہیں: مولوی سید عبدالخالق، مولوی شیر محمد قندھاری، مولوی جلال الدین صاحب، مولوی شیخ کرامت العلی اسرائیلی، مولوی محمد بخش عرف تربیت خاں، مولوی عبدالقادر رام پوری، مولانا اسحاق دہلوی۔"(۲)

مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری (م ۱۹۳۵ء):

مولانا مرحوم "مقدمہ تحفۃ الاحوذی" میں شاہ اسحاق صاحب محدث دہلوی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تخرجت عليه جماعة كبيرة منهم الشيخ الأجل مسند الوقت السيد نذير حسين الدهلوي والشيخ المحدث عبدالغنى بن أبي سعيد المجددي الدهلوي والنواب قطب الدين مؤلف مظاهر الحق وغيرهم، ثم إنه هاجر إلى مكة واستخلف من هو فرد زمانه وقطب أوانه شيخنا الأجل السيد محمد نذير حسين الدهلوي في إشاعة العلوم الحديثية"۔(۳)

یعنی شاہ اسحاق سے پڑھ کر علماء کی ایک بہت بڑی جماعت نکلی جن میں سید نذیر حسین

---

(۱) حیات شبلی طبع دوم ص۔ ۴۵-۴۶۔

(۲) تذکرہ علمائے حال، ص: ۹۲۔

(۳) مقدمہ تحفۃ الاحوذی، طبع دوم، ص: ۵۲۔

دہلوی، شیخ عبدالغنی مجددی، نواب قطب الدین وغیرہ شامل ہیں، پھر شاہ اسحاق صاحب محدث دہلوی نے مکہ مکرمہ ہجرت فرمائی اور شیخ العرب والعجم سید نذیر حسین دہلوی کو علوم حدیث کی اشاعت کے سلسلے میں اپنا جانشین قرار دیا۔

مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی:

مولانا محمد عطاء اللہ حنیف صاحب بھوجیانی "إتحاف السه" کے حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"ثم أقبل خاصة على التفسير والحديث، فقرأ تفسير الجلالين والصحيحين حرفا حرفا على العلامة الشاه محمد إسحاق، وذلك في سنة ١٢٤٩هـ شاركا مع الغير، وقرأ عليه بقية الصحاح الست وموطأ الإمام مالك بتمامها بالضبط والإتقان والتدقيق، وأطرافا من الجامع الصغير للسيوطي وكنز العمال لعلي المتقي (ف ٩٧٥هـ) وفي أثناء هذا قرأ أيضا على الشاه محمد إسحاق في الفقه الهداية للمرغيناني والجامع الصغير للإمام محمد رحمه الله، وكان يفتي ويقضي بحضرة أستاذه، فيفرح ويرضى بفتياه، بل كان الشيخ كثيرا ما يمتحنه في السوالات المشكلة والتلميذ يجيبه أحسن جواب، وهكذا صحب شيخه ثلاثة عشر سنة واستفاض منه فيوضا كثيرا، و أخذ عنه ما لم يأخذ أحد من تلامذته، فبلغ مراتب الكمال وحصل منه الإجازة في شوال سنة ثمان وخمسين بعد الألف ومأتين- (١)

ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی:

ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی صاحب نے بھی میاں صاحب کا شاہ اسحاق سے تلمذ کا مسئلہ شرح وبسط سے ذکر کیا ہے۔ میاں صاحب کے حالات جو ص:۱۲۲ تا ۱۶۰ پھیلے ہوئے ہیں اس کو ملاحظہ فرمائیں۔ (۲)

---

(۱) اتحاف النبلاء، ص ۲۵، مرتبہ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی۔

(۲) تاریخ علمائے حدیث ہند۔

مولانا عبدالحیٔ حسنی لکھنوی (م ۱۳۴۱ھ):

"نزھۃ الخواطر "میں میاں صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" لازم دروس الشيخ محمد إسحاق بن محمد أفضل العمري الدهلوي سبط الشيخ عبدالعزيز بن ولي الله، وأجازه الشيخ المذكور سنة ثمان وخمسين ومأتين و ألف حين هجرته إلى مكة المشرفة"(۱)

یعنی پھر آپ نے شاہ محمد اسحاق دہلوی کے درس میں پابندی سے حاضر ہونا شروع کیا اور شاہ صاحب موصوف نے آپ کو ۱۲۵۸ھ میں سند عطا فرمائی جب کہ آپ ہجرت کر کے مکہ تشریف لے جا رہے تھے۔

مولانا عبیداللہ سندھی (م ۱۹۴۴ء):

جماعت اہل حدیث کے ساتھ مولانا سندھی کی عنایتیں تعارف سے بے نیاز ہیں۔ آپ یہ ماننے پر ہرگز تیار نہیں کہ میاں صاحب ولی اللہی مکتبہ فکر کے امین ہیں، لیکن اس مقصد کے لیے مولانا نے اس ثابت شدہ واقعہ کا انکار نہیں کیا بلکہ بصراحت کہا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد میاں صاحب کا رجحان شوکانی وغیرہ کی طرف ہو گیا اور تقلید (جو ولی اللہی مسلک کی بنیاد ہے) کا انکار کر دیا۔ اس لیے آپ شاہ صاحب کے مکتب فکر سے الگ ہو گئے لیکن جہاں تک شاہ اسحاق سے تلمذ کا مسئلہ ہے اس کے بارے میں پوری وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں:

"انتفع به خلق كثير منهم ابنته الشيخة الصالحة خديجة المكية وابن خالته الشيخ عبد القيم ابن عبد الحي الدهلوي، ومنهم السيد نذير حسين البهاري الدهلوي إمام أهل الحديث والشيخ محمد بن عبد الرحمن السهارنپوري المكي" (۲)

بشیر احمد بن ڈپٹی نذیر احمد:

دلی اور اصحاب دلی پر آپ کی کتاب "واقعات دارالحکومت" کافی مشہور اور مستند ہے

---

(۱) نزھۃ الخواطر، ج، ص: ۳۹۸۔

(۲) حاشیۃ المسوی من احادیث الموطا، ص: ۱۳۔

جاتی ہے اور آج اسے ایک اہم ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ مولوی بشیر احمد صاحب میاں صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ نے مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب علیہ الرحمہ سے حدیث وتفسیر پڑھی اور تیرہ برس تک آپ کی خدمت میں رہ کر آپ نے بہت سے فیوض وبرکات حاصل کیے۔ غرض آپ ایسے مرتبہ کمال کو پہنچ گئے کہ اپنے استاد علام کے سامنے فتوی دیتے اور فیصلے کرتے تھے اور حضرت استاد ان کو پسند کرتے اور خوش ہوتے تھے۔ شوال ۱۲۵۸ھ میں حضرت شاہ محمد اسحاق نے آپ کو علوم حدیث وغیرہ سے مستفید فرما کر مسند الوقت کر دیا اور اسی سن میں جب آپ ہند کو خیر باد کہہ کر مہاجر بیت اللہ ہونے لگے تو افادہ اور افتاء اور وعظ وتذکیر اور درس وتدریس کے لیے آپ ہی کو اپنا نائب اور خلیفہ مقرر فرمایا۔"(۱)

شیخ محمد اکرام:

شیخ محمد اکرام صاحب نواب صاحب کا تذکرہ کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں کہ:

"اس دور کے ایک دوسرے بزرگ جن کا فیض نواب صدیق حسن خاں سے بھی زیادہ پھیلا سید نذیر حسین محدث تھے جو صوبہ بہار کے رہنے والے تھے لیکن پٹنہ میں مولانا سید احمد بریلوی کا وعظ سننے کے بعد (۱۲۴۳ھ میں) دہلی کا رخ کیا اور مسلک ولی اللہی کے کئی بزرگوں سے استفادہ کیا۔ حدیث کی تکمیل آپ نے شاہ محمد اسحاق صاحب مہاجر مکی نبیرہ شاہ عبدالعزیز دہلوی سے کی اور جب وہ مکہ ہجرت کر گئے تو آپ نے دہلی کی مسجد اورنگ آبادی میں حدیث اور تفسیر کا درس شروع کیا اور کوئی پچاس برس اس خدمت عظیمہ میں گذار دیے۔ شمالی ہندوستان کے اکثر علمائے اہل حدیث کا سلسلہ استناد آپ تک پہنچتا ہے اور اسی وجہ سے آپ کو شیخ الکل بھی کہتے ہیں۔"(۲)

خلیق احمد نظامی:

خلیق احمد صاحب نظامی تاریخ کے مشہور عالم ہیں۔ آپ مولانا ارشاد حسین صاحب رام پوری صاحب "انتصار الحق فی رد معیار الحق" کے پوتے ہیں اس لیے بھی اس مسئلے میں آپ کی

---

(۱) واقعات دار الحکومت، از بشیر احمد، طبع اول: ۲/۲۸۔ (۲) موج کوثر، ص: ۶۸۔

رائے کافی اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ میاں صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میاں نذیر حسین صاحب دہلوی حدیث کے مشہور عالم تھے حدیث و تفسیر شاہ محمد اسحٰق سے پڑھی تھی ۱۳ / تیرہ برس تک ان کی خدمت میں رہ کر فیوض و برکات حاصل کیے تھے۔"(۱)

نسیم احمد امروہی:

"الفرقان" فروری و مارچ ۱۹۷۶ء کے مشترکہ شمارے میں مولانا نسیم احمد صاحب امروہی نے "حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کا خاندان" کے عنوان سے ایک مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ شاہ اسحٰق رحمہ اللہ کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"......ان کے باکمال تلامذہ کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ جن میں مفتی عبدالقیوم ابن مولانا عبدالحیٔ بڈھانوی، شاہ عبدالغنی مجددی مہاجر مدنی، قاری عبدالرحمٰن پانی پتی صاحب "مظاہر حق"، نواب قطب الدین خاں دہلوی، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، مولانا شیخ محمد تھانوی، مولانا عالم علی نگینوی ثم مرادآبادی اور مولانا نذیر حسین محدث وغیرہم بھی شامل ہیں۔"(۲)

یہ چند ایسے علمائے کرام کے اعترافات ہیں جن کو سیر و تراجم میں دست گاہ حاصل ہے۔ ان میں دیوبند مکتبہ فکر کے مناد بھی ہیں اور ملک کے دوسرے بلند پایہ تذکرہ نویس بھی۔ ان حضرات کی شہادتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تمام ہی حضرات نے قاری اور قادری صاحب نیز احمد رضا بجنوری وغیرہم کی روش کو بالکل پسند نہیں کیا ہے۔

ظاہر ہے ان بزرگ علمائے کرام کے اعترافات کے سامنے قادری اور بجنوری صاحب کی بیش قیمت تحقیقات کی کوئی وقعت نہیں رہ جاتی، رہ گیا تعصب اور تنگ نظری کا مرض تو وہ لاعلاج ہے۔

آخر میں ہم یہ عرض کر دیں کہ اپنے آپ کو مسلک ولی اللہی کا پابند اور حکمت ولی اللہی کا امین نیز ولی اللہی مکتبہ فکر کا نمائندہ قرار دینے والا دیوبند حد درجہ تضاد کا شکار ہے ایک طرف تو یہ بلند بانگ دعوے ہیں لیکن دوسری طرف شاہ صاحب کی تغلیط، مخالفت اور ان کے مخصوص افکار سے جنگ کا ایک طویل سلسلہ بھی چھیڑ رکھا ہے۔ ہم ذیل میں صرف چند نمونے پیش کرتے ہیں۔

---

(۱) تاریخی مقالات، از پروفیسر خلیق نظامی، ص: ۲۵۳۔

(۲) الفرقان فروری و مارچ ۱۹۷۶ء۔

(۱) شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ عقائد میں اشعریت کے پابند تھے (۱) لیکن دیوبند ماتریدیت کا پیرو ہے۔ (۲) شاہ صاحب کی عمومی دعوت یہ تھی کہ تمام فقہاء کے اقوال کو کتاب وسنت کی کسوٹی پر جانچا جائے جو موافق ہو اس پر عمل کیا جائے (۲) اور مخالف کو ترک کر دیا جائے لیکن دیوبند نہ صرف تقلید جامد کا پابند ہے بلکہ اس کا زبردست داعی اور منادی بھی ہے اور عملاً اس نے یہ طریقہ اپنا رکھا ہے کہ احادیث کو فقہاء حنفیہ کے اقوال کی کسوٹی پر پرکھ کر قبول یا رد کیا جائے۔

ایک اور قدم آگے بڑھ کر دیکھیے تو نظر آتا ہے کہ یہ حضرات شاہ صاحب کو "کم علم، ناقص المطالعہ، متقدمین کی کتابوں سے بے خبر" قرار دیتے ہیں۔

چنانچہ انور شاہ کشمیری (متوفی ۱۹۳۱ء) کے داماد مشہور دیوبندی عالم احمد رضا بجنوری زاہد الکوثری کا یہ قول بڑے عقیدت واحترام کے ساتھ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"علامہ کوثری نے یہ بھی لکھا ہے کہ: "شاہ ولی اللہ کا اصول و مذہب ائمہ مجتہدین کے بارے میں یہ فرمانا کہ وہ متاخرین کے ساختہ پرداختہ ہیں متقدمین سے منقول نہیں، واقعہ کے خلاف ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کے مطالعہ میں وہ کتب متقدمین نہیں ہیں جن میں اصول مذاہب کی نقل ائمہ مجتہدین سے منقول ہے۔" (۳)

ایک اور مشہور دیوبندی عالم مولانا عبد الرشید نعمانی اپنی کتاب "ما تمس إليه الحاجة لمن يطالع سنن ابن ماجة" میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ پر خاصے درشت انداز میں نقد کیا ہے۔ شاہ صاحب کا خیال ہے کہ: "وكان أبو حنيفة رضي الله عنه ألزمهم بمذهب إبراهيم وأقرانه لا يجاوزه إلا ماشاء الله، وكان عظيم الشأن في مذهبه، فانظر في كتاب الموطأ تجده كما ذكرنا، وكان عظيم الشأن في التخريج على مذهبه دقيق النظر في وجوه التخريجات مقبلا على الفروع أتم إقبال، وإن شئت أن تعلم حقيقة ما قلنا فلخص أقوال إبراهيم وأقرانه من كتاب الآثار لمحمد رحمه الله وجامع عبد الرزاق ومصنف أبي بكر بن أبي شيبة، ثم قايسه بمذهبه، تجده لا يفارقه تلك المحجة إلا في مواضع

---

(۱) ملاحظہ ہو: مقدمہ انوار الباری ج ۲، تذکرہ محدثین، ص: ۱۹۷۔

(۲) ملاحظہ ہو: مجموعہ وصایا اربعہ۔ (۳) ملاحظہ ہو: انوار الباری، حصہ دوم، ص ۱۹۶-۱۹۷۔

يسيرة، وهو في تلك أيضا لا يخرج عما ذهب إليه فقهاء الكوفة.[1]

یعنی ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ ابراہیم اور ان کے اصحاب کے مذہب کے سب سے زیادہ وفق تھے، اس مذہب سے بہت کم تجاوز کرتے تھے، ان کے طریقے کے مطابق تخریج میں ان کا پایہ بہت بلند تھا اور وجوہ تخریجات میں انتہائی باریک بیں تھے، فروعات پر تمام تر توجہ تھی۔ اگر میرے اس قول کی حقیقت معلوم کرنی ہے تو امام محمد کی کتاب "الآثار" اور عبدالرزاق کی "جامع" نیز ابوبکر بن ابی شیبہ کی "مصنف" سے ابراہیم کے اقوال کی تلخیص کر لیجیے پھر اس کا موازنہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ امام صاحب اس طریقے سے بہت کم الگ ہوتے تھے اور ان تھوڑی سی چیزوں میں بھی وہ فقہائے کوفہ کے طریقے سے الگ نہیں ہوتے۔

لیکن مولانا نعمانی کو شاہ صاحب کے اس قول سے سخت اختلاف ہے۔ اگر بات صرف اختلاف تک محدود رہتی تو ہمیں اس سے کوئی تعرض نہ ہوتا لیکن معاملہ شاہ صاحب کے استخفاف تک پہونچ گیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"وأما ما قال رحمه الله وإن شئت حقيقة ما قلناه فلخص أقوال إبراهيم من كتاب الآثار لمحمد و جامع عبدالرزاق الخ، فهذا دأبه في تصانيفه إذا أتى بدعوى يأتي بكلام يدهش الناظر."[2]

"یعنی شاہ صاحب کی عادت ہے کہ جب وہ کسی معاملے کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو وحشت پھیلانے والا انداز پیدا کر دیتے ہیں۔"

اس کے بعد اس نقطہ نظر کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فنحن بحمد الله قد طالعنا كتاب الآثار لمحمد، ولخصنا أقوال إبراهيم النخعي رضي الله عنه، ثم قايسناه بمذهب الإمام، فوجدنا الإمام يجتهد كما يجتهد النخعي وأقرانه، ونراه في كثير من المواضع يترك رأي إبراهيم وراءه ظهريا"

"یعنی ہم نے "کتاب الآثار" امام محمد کا مطالعہ کر کے امام نخعی اور حضرت امام ابوحنیفہ

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ ۱/۱۳۶۔ "باب أسباب خلاف مذاهب الفقهاء"

(۲) ما تمس إليه الحاجة لمن يطالع سنن ابن ماجه، ص ۱۳۔

کے اقوال کی تخلیص کی ہے اور ان کا باہم موازنہ بھی کیا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ امام صاحب مختلف مقامات پر ابراہیم نخعی کی رائے کو ترک کر دیتے ہیں۔"

مولانا نعمانی نے شاہ صاحب پر جس درشت انداز میں رد کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے کوئی انتہائی غلط بات کہہ دی ہے مگر حقیقت وہی ہے جو شاہ صاحب نے بیان فرمائی، چنانچہ اس حقیقت کا اعتراف خود بخود زبان قلم پر آ گیا اور فرمایا:

"وإن كان لا ينكر أن لآراء إبراهيم النخعي أثرا خاصا في تفقيه الإمام أبي حنيفة واجتهاده"۔[1]

"مگر اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ابراہیم نخعی کی آراء کا امام ابوحنیفہ کے اجتہاد و تفقہ پر گہرا اثر پڑا۔"

بات وہی ہوئی جو شاہ صاحب نے کہی تھی ان کے تقابل کا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا کہ عدد اور ہندسے کے اعتبار سے مسائل کا جائزہ لیا جائے بلکہ کہنا صرف یہ تھا کہ امام صاحب نے اپنے فقہ و اجتہاد کے لیے انہی قواعد کو اپنا لیا جن کو ان سے پہلے ابراہیم نخعی اور ان کے اصحاب اپنا چکے تھے۔

ظاہر ہے ان تناقضات کے باوجود دعویٰ کرنا کہ مسلک ولی اللہی کا پابند صرف اور صرف دیوبندیت ہے انتہائی حیرت ناک اور مضحکہ خیز ہے۔



(۱) ما تمس إليه الحاجة لمن يطالع سنن ابن ماجه، ص ۱۳۔

فصل سوم

میاں صاحب اور انگریزوں سے وفاداری کا مسئلہ

ایک جائزہ

میاں صاحب اور انگریزوں سے وفاداری

اس مسئلے پر قادری صاحب نے جتنا اور جس مقصد کے تحت لکھا ہے گذر چکا، اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ قادری صاحب کی یہ تحقیقات صاحب ''انوار الباری'' نے حرف بحرف نقل کرلی ہیں۔ (1) کیوں کہ دونوں کا مقصد ایک ہے۔

یہ کوئی نیا اور انوکھا الزام نہیں، ہمیشہ مخصوص حلقوں سے اس کی تکرار ہوتی رہتی ہے۔ قادری صاحب کا تو یہ دل پسند موضوع ہے۔ ''تذکرہ علمائے ہند'' کے علاوہ ''کالا پانی'' میں بھی آپ نے اس موضوع پر خوب داد تحقیق دی ہے۔ (۲) مئی ۱۹۷۶ء کے ''المعارف'' لاہور میں انہیں تحقیقات کو دہرا دیا ہے۔ میاں صاحب کی وفاداری کے متعلق قادری صاحب کے قطعی دلائل یہ ہیں:

۱- ۱۸۵۷ء میں ایک انگریز عورت کی جان بچائی۔

۲- انگریزوں نے انہیں تیرہ سو روپے بطور انعام دیے۔

۳- انگریزوں نے انہیں وفاداری کا سرٹیفیکٹ دیا۔

۴- میاں صاحب نے ایک موقع پر اپنی خدمات کے عوض ڈپٹی کا عہدہ طلب کیا۔

۵- جہاد کے فتوی پر ان سے زبردستی دستخط حاصل کیا گیا۔

یہ ہے وہ فرد جرم جو قادری صاحب نے انتہائی جد و جہد کے بعد عائد کی ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ ان دلائل سے میاں صاحب کو انگریزوں کا وفادار یا کم از کم آزادی کی جد و جہد

---

(۱) مقدمہ انوار الباری: ۲/ ۲۲۸، ۲۲۹۔ (۲) مقدمہ تواریخ عجیب معروف بہ کالا پانی، ص: ۲۶۱-۲۶۴۔

سے کنارہ کش ثابت کر دیں۔

کچھ تاریخ سے ناواقف ان دلائل پر ایک اور دلیل کا اضافہ کرتے ہیں کہ میاں صاحب نے ۱۸۵۷ء کے فتویٰ جہاد پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔[1] مولانا نذیر احمد صاحب املوی (م ۱۹۶۵ء) نے "اہل حدیث وسیاست" میں بعض شبہات کا محققانہ اور مسکت جواب دیا ہے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی (م ۱۹۷۳ء) نے بھی عمدہ بحث کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اختصار کے ساتھ قادری صاحب کے فراہم کردہ ان تمام دلائل کا جائزہ لوں۔

میاں صاحب اور انگریز:

یہ مغالطہ کہ میاں صاحب انگریزوں کے وفادار تھے غلط ذہنیت کی پیداوار ہے۔ اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس ماحول پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے جس میں میاں صاحب کی تربیت ہوئی ہے۔

موصوف کی تعلیم وتربیت جس ماحول میں ہوئی تھی وہاں انگریزوں سے وفاداری کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ سترہ سال کی عمر میں تعلیم کا آغاز پٹنہ سے کیا، یہاں ۳۷-۱۲۳۶ھ مطابق ۱۸۲۱ء میں مولانا محمد حسین خلیفہ سید احمد شہید کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔[2] پٹنہ ہی کے قیام کے زمانے میں سید احمد شہید (م ۱۸۳۱ء) اور شاہ اسماعیل شہید (م ۱۸۳۱ء) پٹنہ تشریف لائے اور اپنی پرتاثیر تقریروں سے توحید وسنت نیز جہاد کی روح پھونک دی۔ میاں صاحب کا بیان ہے کہ آپ بھی ان مواعظ میں شریک ہوئے تھے۔[3]

شہیدین سے بیعت وتعلق کے بعد خاندان صادق پور حرکت وعمل کی ایک مسلسل داستان بن گیا اس نے جہاد وحریت کی قندیل کو جس عزم وہمت کے ساتھ روشن رکھا یہ بس انہی کا کام تھا اسی ماحول میں میاں صاحب نے قرآن کا ترجمہ اور مشکوٰۃ تک کی تعلیم حاصل کی۔[4]

اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے دہلی کا قصد کیا اور بتاریخ ۱۳ ؍ رجب ۱۲۴۳ھ دہلی

---

(۱) ملاحظہ ہو: مقدمہ اہل حدیث اور سیاست، مؤلفہ مولانا نذیر احمد املوی۔

(۲) احیاۃ بعد المماۃ، ص: ۱۵۔

(۳) ایضا، ص: ۱۶۔

(۴) ایضا، ص: ۱۶۔

پہنچے (۱)۔ ہو سکتا ہے کہ دہلی آنے کا قصد شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کے لیے کیا ہو مگر ۱۲۳۹ھ ہی میں شاہ صاحب کی وفات سے یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ دہلی پہنچے تو شاہ اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ کا حلقۂ درس جما ہوا تھا میاں صاحب کی تعلیم صرف مشکوٰۃ تک تھی اس لیے کچھ دنوں تک متعدد اساتذہ سے مزید تعلیم حاصل کی اس کے بعد شاہ اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور ۱۳ ر سال تک مسلسل حضرت شاہ صاحب کی صحبت سے فیضیاب ہوئے اپنی لیاقت اور اپنی محنت سے شاہ اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ کو متاثر کیا اور ان کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ فتویٰ نویسی اور فصل مقدمات جیسی متعدد ذمہ داریاں شاہ صاحب نے بسا اوقات آپ کے سپرد کر دیں۔ (۲)

سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ ہی کے زمانے سے ہندوستان کے مختلف مقامات پر ان کی تحریک کے لیے امدادی مراکز قائم ہو گئے تھے، ان مرکزوں میں دہلی کا مرکز کافی اہم تھا اس کی ذمہ داری شاہ اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ کے سر تھی۔ ظاہر ہے کہ استاذ سے اتنا قریب رہنے والا شخص اپنے آپ کو استاذ کی اتنی اہم مصروفیت سے الگ نہیں رکھ سکتا اس لیے اس سے تاثر بھی ایک فطری چیز ہے۔ چنانچہ مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں:

"مولانا نذیر حسین دہلوی اور مولانا عبداللہ غزنوی بھی مولانا ولایت علی کی پارٹی سے خاص تعلق رکھتے تھے۔" (۳)

چنانچہ میاں صاحب کی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز اسی وقت سے ہو جاتا ہے جب شاہ اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ دہلی میں مقیم تھے۔ مولانا نصیر حسین منگلوری داماد شاہ اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ نے جہاد کے لیے سرحد سے برصغیر کے اکابر کے نام جو اعلام نامہ بھیجا تھا اس میں شاہ اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ساتھ شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی کا نام بھی موجود ہے۔ (۴) یہ اعلام نامہ تقریباً ۱۸۳۷ء میں جاری کیا گیا اس وقت میاں صاحب کی شہرت ایک ابھرتے ہوئے مدرس کی تھی، ظاہر ہے کہ آپ کی گراں قدر خدمات ہی کے سلسلے میں اس کا مستحق سمجھا گیا کہ ان بلند پایہ

---

(۱) احیاۃ بعد المماۃ، ص: ۲۱۔ (۲) مقدمہ غایۃ المقصود، ص: ۱۲۔

(۳) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص: ۱۳۲۔

(۴) ملاحظہ ہو: سرگزشت مجاہدین، ص: ۱۳۷ حاشیہ حق کا شاندار ماضی۔

اصحاب کے زمرہ میں آپ کو بھی شامل کرلیا جائے جن کے بارے میں مولانا مہر کا خیال ہے کہ: " اس تاریک دور میں دعوت حق کے خیر مقدم میں پیش پیش تھے۔"(۱)

۱۸۴۱ء میں شاہ صاحب نے حجاز ہجرت فرمائی آپ کے قیام دہلی کے زمانے تک اس کی نگرانی خود آپ کے ہی ذمہ تھی لیکن ہجرت کے بعد مرکز کی نگرانی یقیناً دوسرے ہاتھوں میں چلی گئی۔ مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ شاہ محمد اسحٰق صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے دلی کے مرکز کو ایک بورڈ کی نگرانی میں دے دیا، بورڈ کی صدارت مولانا مملوک علی (م ۱۸۵۱ء) کو سونپی گئی اور مولانا قطب الدین دہلوی، مولانا مظفر حسین کاندھلوی، مولانا عبدالغنی دہلوی (م ۱۲۹۶ھ) کو بورڈ کا ممبر نامزد کیا گیا۔ (۲)

اس طرح مولانا کے خیال میں میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا اس بورڈ سے عملاً کوئی تعلق باقی نہیں رہ گیا۔ مولانا سندھی کا یہ خیال ہے کہ دہلی کے علاوہ اب اس تحریک کا ایک اور مرکز "پٹنہ" بن گیا تھا، میاں صاحب وغیرہ اسی مرکز سے وابستہ تھے۔ لکھتے ہیں: "مولانا نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ بھی مولانا ولایت علی رحمۃ اللہ علیہ کی پارٹی سے خاص تعلق رکھتے تھے۔" ایک جگہ اور لکھتے ہیں: "مولانا نذیر حسین دہلوی اور نواب صدیق حسن جیسے عالم بھی ان (مولانا ولایت علی) کا ساتھ دیتے تھے۔"(۳)

ظاہر ہے کہ میاں صاحب کا قیام دہلی میں تھا اور دہلی کا پرانا مرکز مولانا سندھی کی تحقیق کے مطابق پٹنوی گروہ سے الگ تھلگ تھا، میاں صاحب کی اس گروہ سے وابستگی محض رسمی نہ تھی بلکہ آپ اس تحریک کے زبردست حامی تھے، آگے چل کر ہم اس طرح کی متعدد شہادتیں فراہم کریں گے کہ میاں صاحب نے دہلی سے سرحد کے مجاہدین کا تعاون برابر جاری رکھا لیکن سردست ہم سندھی صاحب کے دہلوی گروپ اور اس کے بورڈ کی حیثیت واضح کردیں گے۔

بورڈ کی حیثیت:

حقیقت یہ ہے کہ اس پورے گروہ کی سیاسی سرگرمیوں کا وجود خارج میں بالکل نظر نہیں

---

(۱) سرگزشت مجاہدین، ص: ۱۳۷۔
(۲) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک۔
(۳) ایضاً۔

آتا ان کا محافظ یا تو مولانا سندھی کا اختراع پسند دماغ تھا یا مولانا محمد میاں صاحب مرحوم کا ایجاد پسند قلم ہمیں تو خارج میں جو شہادتیں ملتی ہیں اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بورڈ افسانے کے سوا اور کچھ نہیں کیونکہ اس بورڈ کے صدر مولانا مملوک علی (م ۱۸۵۱ء) نے اپنی ساری زندگی دہلی کالج سے وابستہ رہ کر گزار دی جو خالص انگریزوں کا قائم کردہ ادارہ تھا۔ ظاہر ہے کسی حکومت کے وظیفہ خوار سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ حکومت کے خلاف کسی بھی تحریک کی قیادت کر سکے۔ مولانا مملوک علی کی صدارت کے مسئلہ پر نہ صرف ہم کو بلکہ خود مولانا سندھی کے ماننے والوں کو سخت اعتراض ہے، پروفیسر ایوب صاحب فرماتے ہیں: ''ان کی سیاسی سرگرمیوں کی تفصیل تو در کنار اشارہ بھی نہیں ملتا، ان کی زندگی تو تمام تر درس و تدریس سے عبارت رہی ہے۔ لہٰذا یہ صورت کچھ محل نظری معلوم ہوتی ہے۔''(۱)

بورڈ کے دوسرے ممبر مولانا قطب الدین دہلوی ہیں۔ استخلاص وطن اور انگریزوں کے خلاف جد و جہد کے سلسلے میں آپ کا کیا نقطۂ نظر تھا اس کا اندازہ درج ذیل استفتاء اور اس کے جواب سے ہوگا۔ سوال ہے:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ اگر ایک ملک اسلام پر قبضہ نصاریٰ ہو جاوے اور وہ لوگ شرائع اسلام مثل نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ، جمعہ و جماعت وغیرہ میں کسی طرح دست انداز نہ ہوں اور مثل سلطان اسلام کے ان سے تاب مقاومت بھی نہ رہے بلکہ مقابلہ میں خوف شان کسر اسلام ہو جیسا کہ اس وقت ہندوستان میں موجود ہے تو جہاد درست ہے یا نہیں؟

الجواب: صورت مذکورہ میں مؤمنین مستامن نصاریٰ ہیں۔ مستامن کو جس ملک میں استیمان سے رہ رہا ہے جہاد کرنا نہیں چاہیے کہ من جملہ شروط جہاد سے عدم عہد و امان من المسلمین والکفار ہے اور نیز جہاد کے واسطے ظن غلبۂ مسلمین اور قوت و شوکت اہل اسلام کی شرط ہے۔

دستخط محمد لطف اللہ، محمد قطب الدین دہلوی، خادم شریعت
رسول اللہ قاضی و مفتی محمد سعد اللہ، محمد عالم علی (۲)

---

(۱) مولانا احسن نانوتوی، مرتبہ ایوب قادری (تذکرہ مملوک علی نانوتوی)

(۲) تاریخ صحافت اردو: ۲/۳۶۰۔

یہ فتویٰ واضح طور پر ان مجاہدین سرحد کے خلاف حاصل کیا گیا تھا جو سرحد پر جہاد کی شمع روشن کیے ہوئے تھے، یہ وہی افراد تھے جو مولانا ولایت علی اور عنایت علی وغیرہ کی سرکردگی میں کام کررہے تھے، ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے سید صاحب کے ساتھ مل کر علم جہاد بلند کیا تھا لیکن مولوی قطب الدین صاحب دہلوی ان تمام حضرات کے اس فعل کو بڑی صفائی کے ساتھ غیر شرعی بتلا رہے تھے اور مسلمانوں کو جہاد کے عمل سے دست بردار ہونے کا مشورہ دے رہے تھے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ شاہ اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ ایسے شخص کو کیسے اپنے ہندوستانی مشن کی تکمیل کے لیے نامزد کر سکتے ہیں۔

بورڈ کے تیسرے ممبر مولانا عبدالغنی مجددی صاحب ہیں موصوف کے بارے میں قادری صاحب کا یہ بیان گزر چکا ہے کہ آپ نے اپنے استاذ کے مسلک کی اتباع کرتے ہوئے ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز کی سکونت اختیار کرلی۔ (۱) گویا کہ بورڈ کے جتنے اراکین تھے ان تمام نے عملاً اس نظریہ اور مشن کو ترک کر دیا جو شاہ اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر تھا۔

اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ میاں صاحب دہلی میں رہ کر اپنی سیاسی سرگرمیوں کو پوری قوت سے جاری رکھتے ہیں۔ مجاہدین سرحد کی امداد میں بھی پیش پیش ہیں اور جہاد کا علم بلند کرنے والے مجاہدین اور ان کے رہنماؤں سے رابطہ میں ہیں۔ میاں صاحب کے زمانہ میں بھی دہلی کا شمار مجاہدین کے اہم امدادی مراکز میں ہوتا تھا۔

تحریک شہیدین کی امداد واعانت کا کام سب جانتے ہیں کہ انتہائی رازداری کے ساتھ ہورہا تھا۔ تلاش وجستجو کے بعد بھی آج تک وہ طریقہ کار کما حقہ روشنی میں نہ آسکا، اس لیے ہم یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ اس سلسلے میں میاں صاحب نے کیا کچھ کیا لیکن اتنی بات تو بالکل طے ہے کہ میاں صاحب مختلف ذرائع سے جہاد کی شمع کو روشن رکھنے کا انتظام کرتے رہے ہیں۔ اب ہم اجمال کے ساتھ میاں صاحب کی سیاسی سرگرمیوں کا تذکرہ کریں گے۔

---

(۱) تذکرہ علمائے ہند اردو، مولانا یوسف بنوری لکھتے ہیں: ثم تلا الشيخ محمد إسحق صاحبه عبد الغني المجددي المتوفى ۱۲۹۶ھ غير أنه هاجر إلى المدينة فلم يكن أمده في الهند طويلة۔ (مقدمہ لیس الہاری ص: ۱۷)

میاں صاحب انگریزوں کی نظر میں:

انگریزوں کی نظر میں میاں صاحب کی حیثیت انتہائی خطرناک تھی، وہ آپ کو ہندوستانی وہابیوں کا مدار الہام اور قائد سمجھتے تھے۔ ہندوستان کے اندر اس تحریک کے اعلیٰ قائدین سے کافی مستحکم روابط تھے، جن میں قائدین صادق پور سے آپ کے تعلقات کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہابی سازش کیس ۱۸۶۴ء میں جب آپ کے مکان کی تلاشی لی گئی تو ان میں مولانا جعفر تھانیسری کے تین خطوط اور مبارک علی صادق پوری کے دو خطوط پکڑے گئے۔ (۱) اسی طرح سرحد کے قائدین سے بھی آپ کے عمدہ تعلقات تھے، سرحد سے آنے والے قاصد برابر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اسی طرح خط و کتابت کا سلسلہ بھی قائم رہتا تھا، اسی تلاشی کے موقع پر امیر المجاہدین سید عبداللہ صاحب صادق پوری (م ۱۹۰۲ء) کے نام میاں صاحب کا ایک خط پکڑا گیا تھا جس سے ان روابط کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔

میاں صاحب مختلف افراد کو اس بات پر آمادہ کیا کرتے تھے کہ وہ سرحد جا کر مجاہدین کی صف میں شامل ہو جائیں چنانچہ راج محل کے ایک گواہ کا بیان ہے کہ مولانا نذیر حسین صاحب نے اسے سرحد جانے کے لیے آمادہ کیا تھا۔ (۲)

اس کے علاوہ میاں صاحب کی کوشش یہ رہتی تھی کہ اپنے بعد ایک ایسی جماعت تیار کر دیں جو بزرگوں کے شروع کیے ہوئے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے، اس کے لیے آپ نے مخصوص شاگردوں کو تیار کیا اور ان میں جہاد کی روح پھونک دی۔ ان میں مولانا محمد ابراہیم آروی (م ۱۹۰۱ء مطابق ۱۳۱۹ھ) مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی (م ۱۳۳۶ھ) مولانا عبداللہ غازی پوری (م ۱۳۳۷ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آخری دور میں سرحد پار کے مجاہدین کو افراد اور اسلحہ وغیرہ کی فراہمی وغیرہ کا سارا کاروبار انہی حضرات کے ذمہ تھا۔ (۳) مہر صاحب لکھتے ہیں: "گویا آخری دور میں اعانت مجاہدین کا اکثر و بیشتر کام زیادہ تر اہل حدیث حضرات ہی نے انجام دیا۔" (۴)

---

(۱) [illegible]۔

(۲) ہندوستان میں وہابی تحریک، ص ۳۱۵۔

(۳) سرگزشت مجاہدین، ص ۳۳۰۔

(۴) سرگزشت مجاہدین، ص ۳۰۲۔

یہ تمام حقائق اس بات کے گواہ ہیں کہ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ شہیدین کی تحریک جہاد کے صف اول کے قائدین میں تھے، مولانا سندھی کو اس حقیقت کا احساس ہے اور واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ تاریخ کا طالب علم جانتا ہے کہ مولانا عنایت علی غازی (م ۱۸۵۸ء) کی زندگی سے یہ تحریک کھل کر انگریزوں سے ٹکرا رہی تھی۔ (۱) اس طرح دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسی جماعت کی قیادت کر رہے تھے جو انگریزوں سے براہ راست ٹکر لے رہی تھی، اب اس پس منظر میں اگر ایوب صاحب قادری اور رضا صاحب بجنوری کے الزامات کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ یاروں کی صحبت میں پل کر جواں ہوئے ہیں۔

ان حضرات کے استدلال کا سارا دارومدار مؤلف "الحیاۃ بعد المماۃ" کے بیان پر ہے۔ ہم اس بیان پر نقد و جرح کرنے سے پہلے مناسب سمجھتے ہیں کہ ایک اور معاملے کو صاف کر لیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کے ظلم و جور کا سب سے بڑا ہدف اہل حدیث تھے۔ اہل حدیثوں کو سنی برادران کی عنایت سے وہابی کا خطاب دے دیا گیا تھا اور اس کی خوب تشہیر بھی کی گئی تھی۔ وہابی اور باغی انگریزوں کی نظر میں مترادف الفاظ تھے۔ (۲) اس لیے انگریزوں کے ہر ظلم کا نشانہ سب سے پہلے یہی بنتے تھے۔ وہابی سازش کیس کے ہولناک مظالم اب بھی جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیتے ہیں۔ جس وقت "الحیاۃ بعد المماۃ" کی تالیف ہو رہی تھی اس وقت تک یہ اثرات تو بالکل تازہ تھے، دل و دماغ کا ان سے متاثر ہونا بالکل فطری امر ہے۔ چنانچہ میاں صاحب اور آپ کے کنبے نیز دوسرے اہل حدیثوں کو مظالم سے بچانا ہر اہل حدیث کا پسندیدہ کام تھا۔ اسی خیر خواہی کے جذبے میں بعض حضرات کا خیال ہوا کہ میاں صاحب اور ان کے خاندان کو گورنمنٹ کی نظر میں وفادار ظاہر کیا جائے تاکہ پھر ان روح فرسا واقعات کا اعادہ نہ ہو سکے۔ آپ کے سوانح نگار فضل حسین مظفر پوری نے یہی کیا اور میاں صاحب کو وفادار ثابت کرنے کی زبردست کوشش کی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہر شخص کے غور و فکر کا اپنا ایک نظریہ

---

(۱) ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، سرگزشت مجاہدین، اہل حدیث اور سیاست وغیرہ۔
(۲) سرگزشت مجاہدین، ص: ۴۲۔

ہوتا ہے، ضروری نہیں کہ اس کا نظریہ صحیح ہی ہو لیکن بہرحال اس کے اعتبار پر تو تعریض نہیں کی جا سکتی۔ سوانح نگار بھی انسان ہوتا ہے، اس کے اپنے نظریات رہتے ہیں ہم اس سے اس بات کا مطالبہ تو کر سکتے ہیں کہ وہ واقعات کو صحیح ڈھنگ سے پیش کرے لیکن یہ مطالبہ ہرگز نہیں کر سکتے کہ اپنے نظریے کے مطابق کوئی نتیجہ نہ اخذ کرے، لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں اس نظریے سے اختلاف کا بھی پورا پورا حق حاصل ہے واقعات جس کی تائید کریں گے دنیا اسی نظریہ کو مانے گی۔

یہ معاملہ تنہا فضل حسین اور میاں صاحب کا نہیں بلکہ تمام ہی حضرات اس زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں صرف ایک مثال ملاحظہ ہو۔ مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ) حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (م ۱۳۱۷ھ) مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی (م ۱۲۹۷ھ) یہ وہ بلند پایہ شخصیتیں ہیں جن کا شمار آج ارباب دیوبند صف اول کے مجاہدین آزادی میں کرتے ہیں لیکن مشہور دیوبندی عالم مولانا عاشق حسین میرٹھی نے جب "تذکرۃ الرشید" تالیف کی تو ان واقعات کا یکسر انکار کر دیا جسے آج ان حضرات کے کارنامے کے طور پر بیان کیا جاتا ہے اور پوری قوت سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ حضرات گورنمنٹ کے پکے وفادار ہیں۔ لکھتے ہیں: "ہر چند کہ یہ حضرات بے گناہ تھے مگر دشمنوں کے یاوہ گوئی نے ان کو باغی و مفسد اور مجرم و سرکاری خطاوار ٹھہرا رکھا تھا۔ آپ حضرات اپنی مہربان سرکار کے دلی خیر خواہ تھے، تا زیست خیر خواہ ثابت رہے۔"[1]

خصوصاً مولانا رشید احمد گنگوہی کے متعلق لکھتے ہیں: "سمجھے ہوئے تھے کہ میں جب حقیقت میں سرکار کا فرماں بردار ہوں تو جھوٹے الزامات سے میرا بال بھی بیکا نہ ہوگا اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے جو چاہے کرے۔"[2] اسی طرح ایک طویل باب میں ان واقعات پر بحث کرتے ہوئے ان کی تغلیط کی ہے اور سارے فساد کا ذمہ دار قاضی عنایت کو قرار دیا ہے۔

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ ایک ذمہ دار دیوبندی عالم تھے، میرا خیال ہے کہ کوئی بھی انہیں دروغ گو کہنے کی جرأت نہ کر سکے گا اس لیے موصوف کی ان تحقیقات کی حیثیت ایک دستاویز کی سی ہو جاتی ہے، حالات اور قرائن بھی اس بات پر گواہ ہیں کہ یہ حضرات اس طرح کی تمام سرگرمیوں کے ذمہ دار نہ تھے کیونکہ تھانہ بھون کا یہ ہنگامہ اس وقت شروع ہوا تھا جب دہلی دوبارہ

---

(۱) تذکرۃ الرشید ۱/۹ ۔ (۲) ایضاً ۱/۸۰ ۔

انگریزوں کے قبضہ میں جا چکی تھی۔ کیا یہ حضرات اتنے سادہ لوح تھے کہ اس وقت جبکہ سارا ہندوستان انگریز مخالف بنا ہوا تھا خاموش رہتے اور جب دوبارہ انگریزوں کا تسلط ہو جاتا ہے تو انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کرتے۔ اس طرح کی بات کوئی صحیح الدماغ شخص مشکل ہی سے کہے گا۔

دوسرے یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ تھانہ بھون کے ہنگامے کی اصل وجہ قاضی عنایت اللہ کے بھائی کا بے دردانہ قتل تھا۔ اس قتل کا بدلہ لینے کے واسطے قاضی صاحب نے علم بغاوت بلند کیا اور انگریزوں سے جم کر مقابلہ کیا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد حاجی امداد اللہ صاحب وغیرہ سے یہ درخواست کی کہ آپ لوگ ہمارے علاقے میں قضا کا عہدہ سنبھال لیں۔ ظاہر ہے کہ اس پورے ہنگامے میں ان نفوس قدسیہ کا اگر کوئی رول رہا ہے تو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ انہوں نے قاضی صاحب کی یہ درخواست منظور کر لی۔

لیکن ہمارا مقصود یہاں اس مسئلے پر گفتگو کرنا نہیں۔ کہنا صرف یہ تھا کہ یہاں باوجودیکہ قرائن مولانا عاشق علی کے بیان کی تائید کر رہے ہیں پھر بھی قادری صاحب اور بجنوری صاحب سمیت تمام دیوبندی حضرات میرٹھی صاحب کے اس بیان کو ہضم کر جاتے ہیں یا پھر وہی کچھ کہتے ہیں جو میاں صاحب نے فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں: ''تذکرۃ الرشید'' کی تصنیف و ترتیب کا وقت وہ ہے جب برطانوی سامراج کا نقطۂ عروج خط استواء پر پہنچا ہوا تھا اور نہ صرف زبان و قلم بلکہ لوگوں کے ضمیر بھی اس کی عظمت و ہیبت سے متاثر تھے تو آپ کو بھی اپنی تحریر میں وقت کے تقاضے کی تکمیل کرنی پڑی۔ انتہا یہ ہے کہ بعض چیزوں کے اعتراف و اقرار کے لیے بھی انکار کا پیرایہ اختیار کرنا پڑا۔ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی سوانح حیات لکھتے وقت یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ ۱۸۵۷ء اور اس کے نتائج و اثرات کا ذکر ہی نہ کریں اور شمس العلماء کی طرح دامن بچا کر نکل جائیں۔ البتہ تقاضائے وقت یا اپنے طبعی میلان کے باعث آپ نے اپنے بزرگوں کو بچانے کی کوشش زیادہ سے زیادہ کی ہے، چنانچہ اس علاقے میں بغاوت کا اصل بانی اور علمبردار جناب قاضی عنایت علی رئیس تھانہ بھون کو قرار دیا ہے۔

غور فرمایے کیا ''الحیاۃ بعد المماۃ'' کی تالیف کے وقت برطانوی سامراج کا نقطۂ عروج خط استواء پر نہیں پہنچا ہوا تھا یا ''الحیاۃ بعد المماۃ'' کے مصنف کے دل میں اپنے بزرگوں کے بچانے کا داعیہ موجزن نہیں تھا۔ افسوس ہے کہ یہ حضرات جب اپنے مکتبۂ فکر سے باہر کے افراد پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسے وقتی بیانات کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر بعض بلند پایہ اصحاب کی کردار کشی کا ایک حربہ بنا لیتے ہیں۔ مجھے کہنا صرف یہ ہے کہ فضل حسین صاحب کی رائے اس معاملہ میں بالکل کوئی وقعت نہیں رکھتی اس لیے اس کو پیش کرنا لا حاصل ہے، ہم نے میاں صاحب کی سیاسی زندگی کی جو ایک ہلکی سی جھلک پیش کی ہے وہی اس مہمل دعوے کے بطلان کے لیے بالکل کافی ہے۔

وفاداری کی دلیل اور اس کا تجزیہ:

مولانا فضل حسین مظفر پوری، پروفیسر ایوب قادری وغیرہ تمام حضرات وفاداری کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ میاں صاحب نے ایک زخمی میم کی جان بچائی تھی اور ساڑھے تین مہینے تک اس کو بحفاظت رکھا پھر غدر کے خاتمے پر انگریزوں تک پہنچا دیا اور اس کے صلہ میں تیرہ سو روپے بطور انعام حاصل کیے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس دعوے کے تمام پہلوؤں پر گفتگو کریں۔

سب سے پہلے سوال یہ ہے کہ آیا میاں صاحب نے کسی انگریز عورت کو پناہ دی تھی یا نہیں لیکن اس سوال کا جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ یقیناً میاں صاحب نے ایک انگریز عورت کو پناہ دی تھی لیکن یہ عورت کیسے اور کن حالات میں پہونچی تھی یہ البتہ غور طلب ہے۔ صاحب ''الحیاۃ بعد المماۃ'' کا بیان ہے کہ: ''اس عورت کو میاں صاحب ایک ویران مقام سے اٹھا کر اپنے گھر لائے تھے۔''(۱) افتخار حسین صاحب کا کہنا ہے کہ: ''اس میم کو ڈپٹی نذیر احمد صاحب اٹھوا کر لائے تھے۔''(۲) مولانا غلام رسول قلعوی کے صاحب زادے کا بیان ہے کہ ''میرے والد اور مولانا عبد اللہ صاحب غزنوی اس عورت کو میاں صاحب کے گھر لائے تھے۔''(۳)

بشیر احمد صاحب مؤلف ''واقعات دار الحکومت'' لکھتے ہیں کہ: ''میرے نانا نے بھی ایک میم مسز لیسینس کی جان بچائی ان کی عبارت یہ ہے: ''میرے نانا عبد القادر متوسلان شاہی میں

(۱) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۷۷۔ (۲) حیات النذیر، از افتخار عالم بلگرامی: ۴۸/۲۔
(۳) الاعتصام تحریک اہل حدیث نمبر۔

سے تھے، وہ بھی گئے ان کے ساتھ دو پنجابی پٹھان بھی تھے، انہوں نے دیکھا کہ ایک عورت جس نے ہاتھ سے پانی پینے کا اشارہ کیا اپنے گھر لائے اور علاج کیا۔"(۱)

یہ چاروں متضاد بیانات ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں۔ مولانا نذیر احمد الٰہوی (م ۱۹۶۵ء) نے ان میں جمع کی یہ صورت نکالی کہ یہ سب لوگ ساتھ گئے تھے مگر مؤلف "حیاۃ النذیر" نے بتصریح لکھا ہے کہ: "میم کو گھر لانے کے بعد میاں صاحب کو مطلع کیا۔" اسی طرح صاحب "حیاۃ النذیر" نے فضل حسین کے اس بیان کی جم کر تردید کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ "اس میں کچھ شک نہیں کہ مولوی نذیر حسین صاحب اور مولوی عبدالقادر صاحب نے مسز لیسینس کی جان بچائی لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ مولوی نذیر صاحب مسز لیسینس کو اٹھوا کر لائے تھے اور اپنے گھر میں رکھا۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ڈپٹی صاحب اور منیر اور شعیب مسز لیسینس کو کہیں سے اٹھا کر لائے۔ مولویوں نے صرف مذہبی تقاضے سے اس میم کی جان بچائی (۲) کچھ بھی ہو کم از کم تین روایتیں اس بات پر متفق ہیں کہ میاں صاحب میم کو خود نہیں لائے تھے، اس لیے یہ بات تو تقریباً طے ہو جاتی ہے کہ مسز لیسینس کو لانے میں میاں صاحب کا ہرگز کوئی دخل نہ تھا۔

گویا اس سلسلے میں میاں صاحب کا کردار صرف یہ تھا کہ ایک زخموں سے چور مظلوم عورت آپ کے گھر تک لائی گئی۔ خطرہ تھا کہ اگر بلوائیوں کو اس میم کے وجود کی ہوا لگ گئی تو نہ صرف اس کی جان پر بلکہ آپ کے سارے کنبے پر بھی قیامت آجائے گی۔ حالات کی نزاکت کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ نے اس بیچاری کو اپنی حفاظت میں رکھ لیا اور علاج و معالجہ کا معقول انتظام کیا۔ ہنگامہ کے فرو ہونے کے بعد اس کی قوم تک بحفاظت پہونچا دیا۔ صاحب "حیاۃ النذیر" لکھتے ہیں کہ: "یہ سب کچھ بتقاضائے دینداری تھا" ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ: "مولویوں نے صرف مذہبی تقاضے سے اس میم کی جان بچائی۔"(۳)

کیا اتنی سی بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ میاں صاحب انگریزوں کے وفادار تھے۔ واضح رہے کہ اسلامی شریعت میں دشمن کی عورتوں پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں دی گئی ہے اور جہاں تک مجروحین کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں کسی زخمی مقاتل کو بھی قتل کرنے کی اجازت نہیں

(۱) واقعات دار الحکومت۔ (۲،۳) حیاۃ النذیر، ص: ۴۸، ۴۹۔

ہے۔ کیا مسز بیسی کو اسلام کے اس فیاضانہ سلوک سے صرف اس وجہ سے محروم رکھا جاتا کہ وہ انگریز تھی اور اس کا نسلی تعلق ایک ایسی قوم سے تھا جو کل تک ہندوستان کی حکمراں طاقت تھی۔

بہر حال اس واقعہ سے میاں صاحب کی وفاداری پر استدلال کرنا کوئی معقول بات نہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد میاں صاحب کی کتاب ''علمائے حق کا شاندار ماضی'' کا ایک پیراگراف نقل کر دوں۔ سرسید نے ایک جگہ لکھا تھا کہ: ''جن لوگوں کی مہر اس فتوے پر چھاپی گئی ہے ان میں سے بعضوں نے عیسائیوں کو پناہ دی ہے۔'' مولانا محمد میاں صاحب اس پر تعاقب کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''دشمن اگر پناہ مانگیں تو پناہ دینا فتویٰ جہاد کے خلاف نہیں بلکہ جس کلام پاک کی روشنی میں جہاد کا فتویٰ دیا جاتا ہے اس کا حکم ہے: ﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ﴾ [1] اگر برسر جنگ مشرکوں میں سے کوئی پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دو تا کہ اس کو توفیق ہو کہ اللہ کی بات سنے اور اس پر عمل کرے۔ بالخصوص عورت کا معاملہ تو اور ہی نازک ہے۔ حدیث میں خصوصیت سے عورتوں، بوڑھوں، بچوں کے قتل کی ممانعت ہے۔

مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کا خیال ہے کہ: ''اس واقعہ سے استدلال کر کے میاں صاحب کو وفادار ثابت کرنا سعی لاحاصل ہے۔'' مولانا نذیر احمد صاحب املوی نے اس واقعہ کا دلچسپ جائزہ لیا ہے اور مختلف پہلوؤں سے بحث کر کے بالکل دوٹوک فیصلہ کر دیا ہے کہ اس واقعہ کو وفاداری سے بالکل کوئی تعلق نہیں۔

قابل غور بات یہ ہے کہ انگریز دلی سے بے دخل کیے جا چکے تھے، سارے ملک کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں سے تقریباً نکل چکی تھی، جگہ جگہ ان کو قتل کیا جا رہا تھا، ان کی معاونت کے ادنیٰ سے شبہ پر بھی جان و مال سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ ایسے نازک اور مخدوش حالات میں وفاداری کے کیا معنی ہیں؟ کیا میاں صاحب اتنے سادہ لوح تھے کہ انگریزوں کی واپسی کی موہوم سی امید پر اپنی جان اور سارے خاندان کی عزت و ناموس کو داؤ پر لگا دیتے؟

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

---

(1) توبہ: ۶۔

انعام کی حیثیت:

واقعہ کی جو صورت ہم نے پیش کی ہے اس کی روشنی میں وفاداری کا سوال تو پیدا ہوتا ہے لیکن کوئی اس فعل کو وفاداری یا اس طرح کے کسی دوسرے نام سے تعبیر کرے تو یہ اس کا اپنا فعل ہے۔ میاں صاحب پر ہرگز اس کی ذمہ داری نہیں ڈالی جا سکتی لیکن یہ سوال بہر حال باقی رہ جاتا ہے کہ اگر وفاداری مقصود نہ تھی تو اس کام پر انعام اور سرٹیفکیٹ کیوں قبول کیا۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ میاں صاحب نے اس عورت کو انسانیت اور شریعت کے اعلیٰ تقاضوں کے تحت پناہ دی تھی اس لیے آپ کا یہ فعل شرافت اور اعلیٰ کرداری کا بہترین نمونہ تھا۔ ناممکن تھا کہ اس رویہ سے مسز لیسنس متاثر نہ ہوتی۔ اسی تاثر کا نتیجہ تھا کہ اس نے جاتے وقت کہا تھا کہ: ''میں کوشش کروں گی کہ اس کا بدلہ دلواؤں۔''(۱)

اسی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ میاں صاحب کو چار سو روپے اور ایک سرٹیفکٹ دیا گیا یہ چار سو روپے ان نقصانات کی تلافی کے لیے دیے گئے تھے جو میاں صاحب کے خاندان کو برداشت کرنے پڑے تھے لیکن آیئے یہ بھی جان لیں کہ وہ نقصانات کیا تھے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے میاں صاحب کا قیام پنجابی کٹرہ میں تھا۔ صاحب ''الحیاۃ بعد المماۃ'' لکھتے ہیں کہ: ''غدر کے بعد آپ کا محلہ صرف آپ کی وجہ سے محفوظ رہا۔''(۲) لیکن دوسری شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ میاں صاحب کا خاندان اور محلہ پوری طرح سے تباہی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ پنجابی کٹرہ میں میاں صاحب کے پاس دو مکانات تھے۔ ایک مکان تو وہی تھا جس میں آپ رہائش پذیر تھے۔ اس کے علاوہ صاحب ''حیاۃ النذیر'' کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ آپ کا ایک دوسرا نو تعمیر مکان بھی تھا۔ (۳)

لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد پنجابی کٹرہ کو توڑ پھوڑ کا نشانہ بنایا گیا۔ اسی توڑ پھوڑ میں آپ کے یہ دونوں مکانات بھی منہدم کر دیے گئے اور اسٹیشن اور ریلوے لائن میں شامل کر لیا گیا۔ (۴)

لیکن میاں جن چار سو روپوں کا تذکرہ مذکورہ بالا سطروں میں ہوا ہے اس کے علاوہ بھی

---

(۱) حیاۃ النذیر، ص: ۳۸۷۔
(۲) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۱۳۱۔
(۳) حیاۃ النذیر، ص: ۳۸۶۔
(۴) ۱۸۵۷ء، از غلام رسول مہر، ص: ۲۹۵۔

سات سو کی ایک رقم منہدم شدہ مکانات کے معاوضہ کے طور پر دی گئی تھی، چنانچہ اس کی رسید کے اصل الفاظ یہ ہیں:

'Delhi Dated 27th September 1877
From W.G. Waterfield,offg Commissioner.
Moulvi Nazeer Hussain and his son Moulvi Sharif Hussain were with other members of thier family insturumental in saving the life of Mrs. Lessons during the mutiny they tended her when wounded kept her in their house for 31/2 months finally sent her in to the British camp at Delhi.
He says that he has lost in a fire which took place in his house in Delhi all his English certificates. I think this is extremely probable, he probably had certificates from General Noville Chamberlain and General Burnard, Colnel Sytter and others.
I remember the fact well and Mrs Lessons, coming in to capmp. The family received a handsome reward of Rs 400, Rs 700 compansation for the demolition of houses bestowed upon them.
The family all deserve considiration and kindness at our homes.(1)

یہی وہ کل رقم تھی جو میاں صاحب کو انگریزوں سے ملی تھی، اس کی کل مقدار گیارہ سو روپیہ ہوتی ہے لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ میاں صاحب کے ان کرم فرماؤں نے اس رقم کو تیرہ سو تک پہنچا دیا۔ ہمیں تسلیم ہے کہ قادری صاحب نے جو ترجمہ نقل کیا ہے وہ "الحیاۃ بعد المماۃ" میں حرف بحرف موجود ہے لیکن ہمیں پروفیسر صاحب سے یہ حسن ظن ہے کہ آپ انگریزی کے اچھے عالم ہوں گے، ایسی صورت میں ہم کو پروفیسر صاحب سے بجا طور پر یہ توقع تھی کہ موصوف نے

(۱) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: ۸۰۔

ترجمہ کا مقابلہ اصل عبارت سے ضرور کیا ہوگا۔ خاص طور سے ایسی صورت میں یہ ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے جب کہ آپ نے اصل سرٹیفکیٹ کا ترجمہ نقل کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ اگر آپ چاہتے تو اس غلطی کا ازالہ کرسکتے تھے لیکن یہ غلط ترجمہ زیادہ مفید مطلب تھا اس لیے موصوف نے اصلاح کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔

تاہم یہ سوال اب بھی بدستور باقی رہ جاتا ہے کہ میاں صاحب نے ان دونوں چیزوں کو کیسے قبول کرلیا؟

لیکن اس کا جواب واضح ہے۔ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے نتیجے میں جب پوری سیاسی بساط الٹ گئی اور انگریزوں کے قدم اچھی طرح جم گئے تو انہوں نے دار و گیر کا ایک بھیانک سلسلہ شروع کردیا۔ معمولی شبہہ کی بنا پر سخت سے سخت سزا معمولی بات تھی ان وحشت ناک حالات نے ہر شخص کو سراسیما کردیا تھا۔ اس عدم تحفظ کی کیفیت میں ہر شخص اپنی بچت کے پہلو ڈھونڈھنے لگا حتی کہ بہادر شاہ ظفر تک نے جان کی امان طلب کی ایسے ہولناک حالات میں اگر از خود حفاظت کا سامان مہیا ہوجائے تو کیا عقل و خرد کا فیصلہ یہی نہ ہوگا کہ اس سے مستفید ہوا جائے اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر میاں صاحب نے سرٹیفکیٹ اور انعام نہیں بلکہ معاوضہ کو اس مصلحت کے تحت قبول کرلیا کہ انگریزوں کے غیظ و غضب سے محفوظ رہ سکیں تو اس میں قباحت کیا ہے؟ خصوصیت سے ایسی صورت میں جب کہ جہاد کے فتویٰ پر آپ کا دستخط بھی ثبت ہے اور آپ انگریزوں کی ایک مخالف قوت کے نہ صرف معاون و مددگار رہیں بلکہ اس کے قائدین کے درجے میں شامل ہیں۔

گویا دار و گیر کے سارے اسباب مہیا ہیں لیکن ایک بالکل اتفاقی صورت پیدا ہوجاتی ہے جس سے نہ صرف آپ کا بچاؤ ممکن ہے بلکہ مستقبل میں شک و شبہ سے بالاتر ہوکر اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کا ایک زریں موقع بھی مل جاتا ہے ایسی صورت میں اس سہولت سے فائدہ نہ اٹھانا نادانی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

یہاں ایک بات اور بھی قابل غور ہے کہ میاں صاحب کا معاملہ بہر حال جواز کی حدود میں تھا لیکن دوسرے بہت سے علماء نے اس سے بھی کم خطرات کے موقع پر حقائق سے بالکل انکار کردیا۔ مثال کے طور پر شیخ الہند ہی کے معاملے کو لے لیجیے۔ موصوف کو جب ریشمی رومال سازش

کیس میں گرفتار کیا گیا اور دارو گیر کا خدشہ لاحق ہوا تو موصوف نے بڑی صفائی کے ساتھ اس معاملے میں اپنی شرکت کا انکار کر دیا۔ اس انکار کو آپ کے عقیدت مند آپ کی سیاسی بصیرت اور غیر معمولی سوجھ بوجھ کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

چنانچہ مولانا محمد میاں صاحب نے اپنی کتاب '' علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے'' میں اس واقعہ کو ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: ''ہم ذیل میں '' سفرنامہ اسیر مالٹا'' سے ان سوالات اور جوابات کو بجنسہ نقل کرتے ہیں۔ یہ سوالات اور جوابات بذات خود حضرت شیخ الہند کی تاریخ میں مزید برآں جوابات سے حضرت شیخ قدس اللہ سرہ کی ذہانت، ذکاوت، حاضر جوابی کے اندازے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بخوبی علم ہو جائے گا کہ ایک انقلابی عالم کس طرح اپنے دشمن کو احمق بنا سکتا ہے۔''(۱)

معاملہ اسی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ بڑے بڑے شیخ الطائفہ اس طرح کے اقدامات کی مدافعت پر اتر آتے ہیں اور ان کو سند جواز عطا فرماتے ہیں چنانچہ اس معاملہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا حسین احمد مدنی نے جوش عقیدت میں اس کا جواز بھی فراہم کر دیا ہے، لکھتے ہیں: '' ایسے کلمات کو جواب میں استعمال کرنا جن کے دو معنی ہوں متکلم ان کے دوسرے معنی لے اور مخاطب دوسرے معنی لے۔ یہ جھوٹ نہیں ہے۔(۲)

'' اگر کسی بے گناہ غیر مستحق کو کوئی ظالم قتل کرتا ہو اور جھوٹ بول کر اس کو بچانا ممکن ہو تو اس وقت جھوٹ بولنا واجب ہوگا اور اگر جھوٹ کے ذریعہ کوئی بھلائی پیدا ہوتی ہو تو اس وقت جھوٹ بولنا مستحب ہو جاتا ہے۔''(۳)

ہمیں شیخ الہند کے اس رویہ پر بحث کرنی مقصود نہیں، بتانا صرف یہ ہے کہ اس طرح کا طرز عمل اختیار کرنا ایک عام بات ہے۔ اسی لیے ہم شیخ الہند کے اس طرز عمل کو بھی زیادہ معیوب نہیں تصور کرتے البتہ ہمیں شیخ الہند کی ذات سے اس سے زیادہ جرأت مندانہ رویہ کی توقع تھی۔

---

(۱) علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: ۱۵۲/۱۔

(۲) نقوش حیات ۲۰۳/۲۔

(۳) نقوش حیات: ۲۰۵/۲۔

۱۸۵۷ء کا فتویٰ جہاد اور میاں صاحب کا دستخط:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں زیر بحث جہاد کے فتویٰ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ اس فتویٰ کا توڑ مہیا کرنے کے لیے انگریزوں نے ایک دوسرے فتویٰ کی تشہیر کرائی جس میں اس فتویٰ کے مندرجات کا رد کیا گیا تھا۔ مولوی ذکاء اللہ صاحب نے زیر بحث فتویٰ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس فتویٰ کا اثر یہ ہوا کہ جاہل مسلمانوں کا جوش مذہبی زیادہ ہو گیا۔ (۱)

سرسید نے بھی اس فتویٰ کو ایک جنگی چال قرار دیا ہے۔ موصوف کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کو اس فتویٰ اور اس کے مفتیوں سے سخت کد تھی، یہی وجہ ہے کہ موصوف نے اس فتویٰ کو جعلی قرار دینے کی زبردست کوشش کی ہے۔

اس فتویٰ پر دلی کے اکثر بارسوخ اور ذی اثر علماء کے دستخط ثبت ہیں۔ میاں صاحب کی شخصیت ایک خاص اہمیت کی حامل تھی، ناممکن تھا کہ اس سلسلے میں آپ کی رائے نہ معلوم کی جائے اس لیے عام علماء کے ساتھ آپ کا بھی دستخط حاصل کیا گیا۔

اس فتویٰ پر میاں صاحب کا دستخط موجود تھا یا نہیں آج یہ کوئی مسئلہ نہیں بلکہ سب کو اس بات کا اعتراف ہے کہ اس فتویٰ پر آپ کا دستخط ایک قطعی امر ہے۔

البتہ کچھ حضرات نے اس بات کا ہی سرے سے انکار کر دیا ہے کہ میاں صاحب نے اس فتویٰ پر دستخط فرمایا تھا۔ چنانچہ فضل حسین صاحب "الحیاۃ بعد المماۃ" نے لکھا ہے کہ: "میاں صاحب نے فتویٰ پر دستخط کرنے سے سختی کے ساتھ انکار کر دیا اور اس جنگ کو جہاد کے بجائے ہنگامہ اور فساد سے تعبیر کیا۔" (۲)

مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنی شدید عصبیت کے باوجود یہ جرأت نہیں کی کہ میاں صاحب کو انگریزوں کا وفادار قرار دیں البتہ آپ نے میاں صاحب کے سلسلے میں لکھا ہے کہ "آپ غیر جانبدار رہے۔" (۳)

انہیں بیانات کے سہارے بعض حضرات اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ: "۱۸۵۷ء

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ، ص ۶۷۵۔ (۲) الحیاۃ بعد المماۃ، ص ۷۹۔
(۳) ہندوستان کی پہلی سیاسی تحریک، ص ۲۱۰۔

میں میاں صاحب نے جہاد کے فتویٰ پر دستخط کرنے سے انکار کردیا تھا اس طرح جماعت اہل حدیث اسی وقت سے سیاست اور استخلاص وطن کی جد جہد سے کنارہ کش ہوگئی۔''(۱)

مولانا نذیر احمد املوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''اہل حدیث اور سیاست'' میں میاں صاحب کے لیے غیر جانبدار ہونے کا موقف اختیار کیا ہے اور میاں صاحب کے اس طرز فکر کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے نفیس بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ فتویٰ پر دستخط نہ کرنا وفاداری کا ثبوت ہرگز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ (۲)

لیکن جہاں تک واقعہ کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ اس فتویٰ پر میاں صاحب نے نہ صرف دستخط اور مہر ثبت کیا تھا بلکہ اصل مجیب کے بعد آپ ہی کے تائیدی دستخط کو رکھا گیا۔ یہ فتویٰ سب سے پہلے ''الظفر'' دہلی میں مشتہر کیا گیا، اسی کی نقل ''صادق الاخبار'' میں شائع ہوئی۔ اصل فتویٰ کا فوٹو ڈاکٹر ازہر نے اپنی کتاب ''ستتر'' دہلی کے آخر میں شامل کردیا ہے۔ اسی طرح ''نوائے آزادی'' مرتب کردہ انجمن اسلام بمبئی کے ص ۸ میں بھی موجود ہے، اس کی نقل مولانا محمد میاں صاحب نے اپنی کتاب ''علماء حق کا شاندار ماضی'' میں شامل کردی ہے۔

اس فتویٰ میں اصل مجیب کی حیثیت سے سب سے پہلے نور جمال کا دستخط ثبت ہے، اس کے بعد پہلا تائیدی دستخط شیخ الکل حضرت مولانا نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کا ہے۔ (۳)

اس طرح اب یہ معاملہ صاف ہوگیا کہ اس مفروضے میں کوئی حقیقت نہیں کہ میاں صاحب نے فتویٰ جہاد پر دستخط کرنے سے انکار کردیا تھا اور یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ گئی کہ اس فتویٰ پر میاں صاحب نے دستخط کیا تھا۔

لیکن یہاں بعض حلقوں کی طرف سے ایک نیا شوشہ چھوڑ اگیا کہ اس فتویٰ پر دستخط کرنے والے علماء میں عبدالرب صاحب دہلوی اور میاں سید نذیر حسین صاحب کے دستخط جبراً حاصل کیے گئے تھے کیونکہ یہ لوگ یا تو سیاست سے کنارہ کش تھے یا انگریزوں کے وفادار تھے، اسے اتفاق سے تعبیر کریں یا کسی سوچے سمجھے منصوبے کا نام دیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان میں ایک مشہور اہل حدیث عالم ہے اور دوسرا اس کا قریبی رشتہ دار ہے۔

---

(۱) اہل حدیث دہلی، یکم دسمبر ۱۹۶۱ء۔
(۲) اہل حدیث اور سیاست، ص: ۲۵۲-۲۶۳۔
(۳) علمائے حق کا شاندار ماضی، ص: ۱۹۸۔

ہمیں سردست صرف میاں صاحب سے متعلق اس نئے انکشاف کی تحقیق مطلوب ہے اس لیے ہم مولانا عبدالرب صاحب دہلوی کے متعلق اس الزام سے تعارض نہیں کریں گے۔

میاں صاحب سے متعلق یہ شوشہ چھوڑتے ہوئے پروفیسر ایوب صاحب قادری لکھتے ہیں:

"میاں نذیر حسین نے دستخط تو کر دیا مگر اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس تحریک میں دل سے شریک نہ تھے بلکہ اس وقت کے حالات کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اس فتوٰی پر مجبوراً دستخط کر دیے تھے، ان کی سرگرمیوں کا دائرہ بس درس و تدریس تک محدود تھا عملی سیاست سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔"

اس انوکھی تحقیق کی دلیل یہ ہے کہ شمس العلماء ڈپٹی ذکاء اللہ مرحوم نے لکھا ہے کہ:

"جن مولویوں نے فتوٰی پر مہریں کیں تھیں وہ کبھی پہاڑ کے دامن پر انگریزوں سے لڑنے نہیں گئے، مولوی سید نذیر حسین جو وہابیوں کے مقتدٰی اور پیشوا تھے ان کے گھر میں تو ایک میم چھپی بیٹھی تھی۔"(۱)

افتخار عالم مارہروی لکھتے ہیں:

"آفت یہ ٹوٹ پڑی کہ دوران بغاوت جنرل بخت خاں نے ان مولویوں سے زبردستی جہاد کے فتوٰی پر مہریں کرالیں۔"(۲)

ان قیمتی دلائل میں ہم ایک اور دلیل کا اضافہ کیے دیتے ہیں کہ سرسید نے بھی اس سے ملتی جلتی تحقیق پیش کی ہے۔

یہی وہ بیش قیمت دلائل ہیں جن کی بنیاد پر یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ میاں صاحب نے مجبوراً فتوٰی پر دستخط اور مہر کر دی تھی، آئیے ان دلائل کا تجزیہ کریں۔

ہم حیران ہیں کہ ان قیمتی دلائل میں کون سے ایسی شے موجود ہے جس سے یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ میاں صاحب نے بالجبر دستخط کیا تھا۔ اگر ڈپٹی ذکاء اللہ اور ان جیسے چند حضرات کے بیانات پر اعتماد کر کے ایسا کہتے ہیں تو بدترین مغالطہ ہے، یہ تمام حضرات بیک زبان فرماتے ہیں کہ علماء کے فتوٰی کی ساری کارروائی جبراً کرائی گئی تھی۔

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ، ص: ۶۷۵۔ (۲) حیات نذیر، ص ۳۸۔

چنانچہ افتخار عالم مارہروی کا بیان گزر چکا ہے ڈپٹی ذکاء اللہ صاحب کا بیان دیکھیے فرماتے ہیں "جب بخت خاں دلی میں آیا تو اس نے جامع مسجد میں مولویوں کو جمع کرکے جہاد کے فتویٰ پر دستخط اور ان کی مہریں کرائیں اور صدر الدین نے بھی ان کے جبر سے اپنی جعلی مہر کردی۔ جن مولویوں نے فتویٰ پر مہریں کیں تھیں وہ کبھی پہاڑی دامن پر انگریزوں سے لڑنے نہیں گئے اس پر کچھ مہریں اصلی اور کچھ جعلی تھیں۔"(۱)

سرسید لکھتے ہیں "دلی میں جو فتویٰ جہاد کا چھپا وہ ایک عمدہ دلیل جہاد کی سمجھی جاتی ہے مگر میں نے تحقیق سے سنا ہے اور اس کے اثبات پر دلیلیں ہیں کہ وہ محض بے اصل...... جب فوج نمک حرام میرٹھ سے دلی میں گئی فتویٰ دیا کہ جہاد نہیں ہوسکتا۔ مگر جب بریلی کی فوج دلی میں گئی اور دوبارہ فتویٰ ہوا جو مشہور ہے اور جس میں جہاد کرنا واجب لکھا ہے بلاشبہ اصلی نہیں۔ چھاپنے والا اس فتویٰ کا جو ایک مفسد اور قدیمی بدذات آدمی تھا جاہلوں کے بہکانے اور ورغلانے کو لوگوں کے نام لکھ کر اور چھاپ کر اس کو رونق دی تھی بلکہ ایک آدھ مہر ایسے شخص کی چھاپ دی تھی جو قبل غدر مر چکا تھا۔ چند آدمیوں نے فوج باغی بریلی اور اس کے مفسد ہمراہیوں کے جبر اور ظلم سے مہریں بھی کیں تھیں، دلی میں ایک بڑا گروہ مولویوں کا ایسا تھا جو مذہب کی رو سے معزول بادشاہ دلی کو بدعتی سمجھتا تھا، پھر کبھی عقل قبول کر سکتی ہے کہ ان لوگوں نے جہاد کے درست ہونے میں اور بادشاہ کو سردار بنانے میں فتویٰ دیا ہو، جن لوگوں کی مہر اس فتویٰ پر چھاپی گئی ان میں سے کوئی شخص لڑائی پر نہیں گیا اگر وہ ایسا ہی سمجھتے جیسا کہ مشہور ہے تو یہ باتیں کیوں کرتے؟(۲)

آپ دیکھیے دونوں حضرات کس شد و مد کے ساتھ اس فتویٰ جہاد کو جعلی، وضعی اور بے بنیاد قرار دے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسے پہلے دیے گئے صحیح فتویٰ کا توڑ کرنے کے لیے بدذات لوگوں نے شائع کر دیا تھا، ایسی صورت میں اگر ان حضرات کے بیانات کو واقعہ تسلیم کر کے کوئی رائے قائم کی جائے تو دوٹوک رائے یہ ہوگی۔ جہاد کا فتویٰ ہی سرے سے جعلی، وضعی اور محض ڈھکوسلا تھا جس کی حیثیت ایک جنگی چال کی سی تھی اور بس!

ظاہر ہے کہ یہ تمام حضرات اس نتیجے کو ماننے کے لیے ایک منٹ کے لیے بھی تیار نہیں

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ، ص: ۶۷۵۔ (۲) اسباب بغاوت ہند، ص: ۱۰۷۔

دیکھیے محمد میاں صاحب کس درشت انداز میں لکھتے ہیں:

''بہر حال دستخط کے وقت نہ مرعوبیت تھی نہ جبر وقہر بلکہ سوچ سمجھ کر بحث وتمحیص کے بعد دستخط کیے گئے، ناکامی کے بعد جب دار و گیر شروع ہوئی تو ممکن ہے کہ کچھ علماء نے جبر کا عذر پیش کر دیا ہو۔''(۱)

ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

''بیشک سرسید اور شمس العلماء نے ضرور لکھا ہے کہ کچھ علماء سے جبراً دستخط لیے گئے مگر ان دونوں کی تصنیفیں اس وقت کی ہیں جبکہ ۱۸۵۷ء کو ختم ہوئے کئی سال گزر چکے تھے اور اب ہمدردان ملت کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کو انگریزوں کا وفادار ثابت کریں اور یہ ظاہر کریں کہ جو کچھ ہوا اس کی ذمہ دار انقلابی فوج تھی جو ختم ہو چکی ہے اور جس کے افراد وہ بیشتر مارے جا چکے ہیں یا فرار ہو گئے ہیں۔''(۲)

۱۸۵۷ء میں مفتی صدر الدین کا کردار کیا تھا یہ مسئلہ شروع ہی سے زیر بحث رہا ہے۔ شمس العلماء ڈپٹی ذکاء اللہ خاں کے علاوہ متعدد مراجع میں اس بات کی تصریح موجود ہے کہ مفتی صدر الدین صاحب نے اس فتوی پر مجبوراً دستخط کیا تھا اس لیے مفتی صاحب اس سلسلے میں قصوروار نہیں، خود مفتی صاحب کے رویہ سے بھی اس موقف کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ غدر کے خاتمے کے بعد جب مفتی صاحب بھی انگریزوں کی نظر میں معتوب قرار پائے اور ضبطی جائداد وغیرہ کی سزا ملی تو موصوف نے اس سلسلے میں پوری کوشش صرف کی کہ آپ کو ان سزاؤں سے بری کر دیا جائے چنانچہ مفتی صاحب اپنے اس مقصد میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئے۔ صاف ظاہر ہے کہ مفتی صاحب ان سزاؤں کے خلاف جو جنگ آزادی میں شرکت کے جرم میں دی گئی تھیں اسی بناء پر اپیل کر رہے تھے کہ آپ کا دامن اس جرم ''بغاوت'' سے پاک تھا اور آپ واقعی اس سلسلے میں خود کو بے قصور تصور کرتے تھے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس سلسلے میں جد وجہد کرتے اور انگریزوں سے تخفیف سزا کی درخواست کرتے جو صرف اس بات پر منحصر تھی کہ خود آپ کو انگریزوں کا وفادار ثابت کر دیں۔ انگریزوں کی طرف سے سزا میں تخفیف خود اس بات

(۱) علمائے حق کا شاندار ماضی: ج۴/۱۹۷۔ (۲) ایضاً ۴/۲۵۶۔

کی دلیل ہے کہ مفتی صاحب نے اعلیٰ انگریزی افسران کو اس بات کا یقین دلا دیا تھا کہ موصوف گورنمنٹ انگلشیہ کے وفادار ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مفتی صاحب موصوف کی زندگی کا بیشتر حصہ انگریزوں سے تعاون میں گذرا تھا، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ مفتی صاحب انگریزی عدالت میں ایک لمبے عرصے تک ملازم رہے ہیں۔(1)

انہیں وجوہات کی بناء پر مفتی صاحب کے بارے میں یہ لطیفہ مشہور ہوا کہ مفتی صاحب سے جب دستخط طلب کیا گیا تو آپ نے دستخط اور مہر ثبت کرنے کے بعد "شہدت بالخیر" کا اضافہ کردیا، اس ذومعنی کلمہ کے اضافہ سے مفتی صاحب کا مقصود یہ تھا کہ جو عناصر آپ سے دستخط کا مطالبہ کررہے ہیں ان کو اس طرح خاموش کردیا جائے اور وہ تصور کریں کہ مفتی صاحب نے یہ تصدیق نیک نیتی کے ساتھ کی ہے، اسی طرح اس فتویٰ سے انگریزوں کے عتاب سے محفوظ رہ سکیں کہ میں نے تو جبراً دستخط کیا تھا۔ چنانچہ فتویٰ میں "شہدت بالجبر" لکھا ہوا ہے اس طرح دونوں فریق اپنی اپنی جگہ پر مطمئن ہوجائیں۔

مفتی صدرالدین صاحب کے اس فتویٰ پر دستخط کا قضیہ میں نے مندرجہ بالا سطور میں پیش کیا ہے۔ ہم نے اس بحث میں پڑے بغیر کہ مفتی صاحب کے سلسلے میں حقیقی کردار کیا تھا، صرف یہ دکھایا ہے کہ مفتی صاحب کے دستخط کا معاملہ حد درجہ مشکوک ہے۔

لیکن اس کے باوجود یہ تمام حضرات اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ مفتی صاحب نے جبراً دستخط کیا تھا۔ مولانا محمد میاں صاحب لکھتے ہیں: "وہاں شہادت بالجبر کا موقع کہاں تھا متعدد علماء وہ تھے جنہوں نے اس فتویٰ پر دستخط نہیں کیے تھے اور وہ اس قیامت خیز دور میں بھی تحریک کے مخالف دہلی ہی میں رہے انہوں نے فتویٰ پر دستخط نہیں کیا اور نہ مجبور کیا گیا۔(2)

---

(1) تذکرہ علمائے ہند، رحمن علی، ص:۹۳، وحدائق الحنفیہ، فقیر محمد جہلمی، ص:۴۸۱۔

ان تمام حضرات نے واضح الفاظ میں نواب صاحب کی "بے گناہی" کی حمایت کی ہے۔ صاحب حدائق الحنفیہ لکھتے ہیں: "بلکہ فتوائے جہاد کے اشتباہ میں چند ماہ تک نظر بند رہے، چونکہ اصل میں بے قصور تھے، آخر میں رہائی پاکر لاہور میں تشریف لائے۔" [ص:۴۹۳]

(2) علماء حق کا شاندار ماضی، ص:۲۵۲/۴۔

اس کے برعکس جب میاں صاحب کا معاملہ سامنے آتا ہے تو بڑی معصومیت سے لکھتے ہیں: "بہر حال فتویٰ کے دستخطوں میں اس نام کے متعلق یہ بیان اہمیت اختیار کر لیتا ہے کہ کچھ دستخط جبراً ہوئے۔"(۱)

مگر جب ضمیر کی آواز چین نہیں لینے دیتی تو دبے لفظوں میں کہتے کہ: "اگرچہ ہمیں اب بھی اطمینان نہیں جس کی وجہ چند سطروں کے بعد ظاہر ہوگی۔"(۲)

اس دورخی پالیسی کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ میاں صاحب غیر مقلد ہیں اور مفتی صدرالدین صاحب کٹر مقلد۔ اس لیے میاں صاحب کے بارے میں یہ نظریہ قابل قبول ہے کہ موصوف نے بالجبر دستخط کیا تھا البتہ مفتی صاحب یا اس طرح کے دوسرے علمائے احناف جن کے بارے میں یہ تصریح موجود ہے کہ انہوں نے بجبر دستخط کیا تھا ان کے سلسلے میں یہ نظریہ البتہ قابل قبول نہیں۔

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

واقعی تعصب اور تنگ نظری آدمی سے کیا کچھ نہیں کرا لیتی۔ میاں صاحب کے بارے میں سرسید اور شمس العلماء کے طرز عمل کی یہ توجیہہ پیش کی جا سکتی ہے جو واقعہ بھی ہے چونکہ شمس العلماء وغیرہ آپ کو گورنمنٹ کے مواخذہ سے بچانا چاہتے تھے۔ اتفاقاً ایک انگریز خاتون کو پناہ دینے کا واقعہ پیش آ گیا، اس کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر ان حضرات نے اپنے مقصد میں استعمال کیا اور اس حد تک کامیاب ہو گئے کہ وقتی طور پر میاں صاحب کے سر سے دار و گیر کی مصیبت ٹل گئی۔

"شهدت بالخير" کے مقولے سے بھی ان حضرات نے وہی مقصد حاصل کرنا چاہا مگر اس میں زیادہ جان نہ تھی اس لیے کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے اور مفتی صاحب بے چارے دار و گیر کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکے۔

---

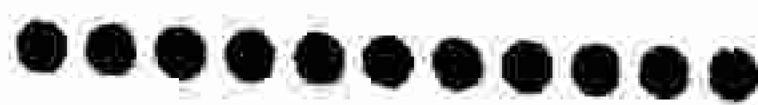
(۱) علمائے حق کا شاندار ماضی: ۱۹۳/۴۔

(۲) ایضاً۔

<u>خلاصہ:</u>

یہ کہ فتویٰ جہاد پر میاں صاحب کے دستخط کا انکار کرنا یا فتویٰ کو جعلی نہ مانتے ہوئے آپ کے دستخط کو جبر کا نتیجہ قرار دینا قطعی غلط ہے اور اس پر یہ عمارت کھڑی کرنا کہ آپ انگریزوں کے وفادار تھے۔۔ صریح زیادتی ہے جو تعصب کی آغوش میں پروان چڑھی ہے، اللہ ایسی مصیبت سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

اللهم أرنا الحق حقا وارزقنا اتباعه، وأرنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه. وصلى الله على خير خلقه محمد وآله وصحبه أجمعين.



مراجع

(۱)القرآن الکریم

(۲)اتحاف النبیہ ،شاہ ولی اللہ/ترتیب عطاء اللہ بھوجیانی ،اشرف پریس لاہور۔

(۳)الاعتصام ہفت روزہ/تحریک اہل حدیث نمبر،ترتیب :مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی۔

(۴)ارواح ثلاثہ،ترتیب وتعلیق :مولانا اشرف علی تھانوی،سہارنپور،۱۳۷۰ھ۔

(۵)الفرقان-ماہنامہ-شاہ ولی اللہ نمبر،مولانا منظور نعمانی۔

(۶)انوار الباری-مقدمہ،احمد رضا بجنوری،۱۹۶۹ء۔

(۷)اہل حدیث اور سیاست،مولانا نذیر احمد املوی،بنارس،۱۹۷۲ء۔

(۸)تاریخ بغداد،خطیب بغدادی۔

(۹)تاریخ عروج عہد انگلشیہ،مولوی ذکاء اللہ۔

(۱۰)تاریخ صحافت اردو،امداد علی صابری،دہلی۔

(۱۱)تاریخی مقالات،خلیق احمد نظامی،دہلی،۱۹۶۶ء۔

(۱۲)تذکرہ علمائے حال،محمد ادریس نگرامی،لکھنؤ،۱۸۹۷ء۔

(۱۳)تذکرہ علمائے ہند(رحمان علی)ترجمہ ایوب قادری،کراچی،۱۹۶۱ء۔

(۱۴)تذکرۃ الرشید۔

(۱۵)تواریخ عجیب(کالا پانی)(ضمیمہ)،محمد جعفر تھانیسری/تحقیق:ایوب قادری،کراچی،۱۹۶۲ء۔

(۱۶)الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیۃ،عبد القادر قرشی،حیدرآباد۔

(۱۷)حجۃ اللہ البالغۃ،شاہ ولی اللہ الدہلوی۔

(۱۸)الحیاۃ بعد المماۃ،فضل حسین مظفرپوری،دہلی،۱۹۰۸ء۔

(۱۹)حیات شبلی،سید سلیمان ندوی،اعظم گڑھ،۱۹۷۰ء۔

(۲۰) حیات النذیر۔

(۲۱) سرگزشت مجاہدین، غلام رسول مہر، لاہور، ۱۹۵۶ء۔

(۲۲) سید احمد شہید، غلام رسول مہر۔

(۲۳) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، عبید اللہ سندھی، لاہور، ۱۹۴۲ء۔

(۲۴) علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، مفتی شبابی، دہلی۔

(۲۵) علمائے حق کا شاندار ماضی، محمد میاں، دہلی۔

(۲۶) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، اکتوبر ۱۹۰۲ء۔

(۲۷) غایۃ المقصود، شمس الحق ڈیانوی، مطبع انصاری، دہلی۔

(۲۸) ما تمس الیہ الحاجۃ، عبد الرشید نعمانی۔

(۲۹) مجموعہ وصایا اربعہ، مرتبہ ایوب قادری، سعیدیہ آرٹ پریس، حیدرآباد ۱۹۶۲ء۔

(۳۰) المسوی من احادیث الموطا، شاہ ولی اللہ دہلوی، المطبعۃ السلفیۃ، مکہ۔

(۳۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی، مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوری، مطبع جدید، [illegible]۔

(۳۲) مقالات شیروانی، حبیب الرحمٰن شیروانی، دہلی ۱۹۶۳ء۔

(۳۳) موج کوثر، محمد اکرام، لاہور، ۱۹۶۸ء۔

(۳۴) مولانا احسن نانوتوی، ایوب قادری، کراچی ۱۹۶۶ء۔

(۳۵) موطا، امام مالک۔

(۳۶) نزہۃ الخواطر، عبد الحی حسنی۔

(۳۷) نقوش حیات، مولانا حسین احمد مدنی۔

(۳۸) واقعات دار الحکومت، بشیر احمد، طبع اول ۱۹۱۹ء۔

(۳۹) ہدایۃ المرتاب، سعید احمد بناری۔

(۴۰) ہندوستان میں وہابی تحریک، قیام الدین احمد۔

(۴۱) ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، مسعود عالم ندوی۔

نام و پتہ طلبۂ فضیلت سال آخر

جامعہ سلفیہ (مرکزی دارالعلوم)

بنارس، الہند

(۲۰۱۵-۱۶ء)

اسمائے فارغین جامعہ سلفیہ بنارس (۱۶-۲۰۱۵ء)

نجم الحق ابوالمازجن پتہ: تمیاپور، املی گاؤں، جلال گڑھ، پورنیہ، بہار پن نمبر: 854327 موبائل نمبر: 9572119468,76542742ـ1 najmultabassum@gmail.com	انتاج عالم سراج الاسلام پتہ: جھنگھریا، کھیکھر ٹولا، چکلیہ، اتردیناج پور، مغربی بنگال، پن نمبر: 733208 موبائل نمبر: 9647136588 intajulhaqul942@gmail.com
زبیر عالم شمس الضحیٰ پتہ: تین کھمبا بیلا، بیلا تھانا، گھرنہ، ارریہ، بہار پن نمبر: 854336 موبائل نمبر: 9199834856 zalamsalafi1996@gmail.com	عبداللہ ثاقب مقصود عالم پتہ: مولا نگر، جگنا تھ پور، مغربی سنگھ بھوم، جھارکھنڈ پن نمبر: 833203 موبائل نمبر: 9155684010 saquibabdullah00@gmail.com
بحرالاسلام شمس الحق پتہ: سترا کنارا نمبر ۵، سترا کنارا، بر پیٹا، آسام پن نمبر: 781308 موبائل نمبر: 8876264552 bahrulshamsi@gmail.com	سراج الدین عبدالکریم پتہ: کیندوا، چین پور، نرائن پور، جامتاڑا، جھارکھنڈ پن نمبر: 815352 موبائل نمبر: 8002504394 serajuddinsalafi@gmail.com
فوزان الٰہی ظہیر ظہیر احمد پتہ: لال پارسا، بہری بنکٹوا، سکٹا، مغربی چمپارن، بہار، پن نمبر: 845307 موبائل نمبر: 7091511541,9801067850	قیصر اعظم علیم اللہ پتہ: رہٹی، ترلوچن بڑا گاؤں، جون پور، یوپی پن نمبر: 222136 موبائل نمبر: 9807450835 quaisarjp5@gmail.com

محمد نسیم اختر جمال الدین

پتہ: کولا، کنکلی، کے نگر، پورنیہ، بہار

پن نمبر:854303

موبائل نمبر:8084728851

mdnasimakhtarsalafi@gmal.com

صلاح الدین شیخ محمد مرتضیٰ علی

پتہ: جتیش نگر، پاکوڑ، جھارکھنڈ

پن نمبر:816107

موبائل نمبر:

9709177552,8873856239

عبدالرحمٰن نوہر علی

پتہ: بیکھوئیا، ڈبرا، سدھارتھ نگر، یوپی

پن نمبر:272205

موبائل نمبر:9129565289

محمد سراج منظور خاں

پتہ: ملڑکھیڑا، ٹبی، ہنومان گڑھ، راجستھان

پن نمبر:335526

موبائل نمبر:7860082154
8503930294

sirajkhan.msk@gmail.com

روح الامین محمد یونس

پتہ: بھنی، مہاپور، پران پور، کٹیہار، بہار

پن نمبر:854116

موبائل نمبر:8804271713

محمد آصف شمس الحق

پتہ: جھٹکیا، پوکھریا، پورنیہ، بہار

پن نمبر:854326

موبائل نمبر:8405854785
8873467717

mohammadasifsalafi99@gmail.com

محمد مستقیم رائن محمد امین رائن

پتہ: ٹھیلہ یدوا، سبیلا بازار، انچل جنکپور،

دھنوشا، نیپال

موبائل:009779812125864

mdmustaqimamin@gmai com

علیم الدین الطاف شیخ

پتہ: عبداللہ پور نیاپاڑا، بی۔ بھاٹرا، مورارئی،

بیر بھوم، مغربی بنگال، پن نمبر:731219

موبائل نمبر:9547138589
8176858134

alimuddins810@gmail.com

رضوان احمد نور محمد
پتہ: دراز ماٹھ، ڈانگا پاڑا، ہرنپور، پاکوڑ،
جھارکھنڈ، پن نمبر: 816104
موبائل نمبر: 7050065450
rizwanahmadsalafi@gmail.com

مختار احمد عبدالواحد
پتہ: دراز ماٹھ، ڈانگا پاڑا، ہرنپور، پاکوڑ،
جھارکھنڈ، پن نمبر: 010104
موبائل نمبر: 0572884020

عبداللہ محمد امتیاز
پتہ: چھپبا، پریہار، سیتامڑھی، بہار
پن نمبر: 843324
موبائل نمبر: 9525016896
abdullahimteyaz117@gmail.com

افضل حسین جمشید علی
پتہ: بل باڑی گنج، ٹھاکھاس، براری کٹیہار،
بہار، پن نمبر: 854107
موبائل نمبر: 9931729915

عبدالقادر محمد منیرالدین
پتہ: اونچلا، بھنڈارتل، براری، کٹیہار، بہار
موبائل نمبر: 9044955949
9507560626
abdulquadirsalafi@gmail.com

سعیدانور خیرالاسلام
پتہ: احمد پور ڈوم پاڑا، اگلوئی، برہروا، صاحب
گنج، جھارکھنڈ، پن نمبر: 816101
موبائل نمبر: 8651064851
saeedfar8651@gmail.com

عبدالرحمن عتیق الرحمن
پتہ: بیر پور مستحکم، بیر پور، ڈومریا گنج،
ترلوک پور، سدھارتھ نگر، یوپی
پن نمبر: 272189
موبائل نمبر 8354892939
erahman837@gmail.com

محمد عرفان محمد مصطفیٰ
پتہ: بیر پور کوہل، بیر پور، ڈومریا گنج،
ترلوک پور، سدھارتھ نگر، یوپی-
پن نمبر: 272189
موبائل نمبر: 9838287320

عبدالحکیم عبدالبصیر
پتہ: کمٹیا، سیتاپور، بیرپور، سپول، بہار
پن نمبر: 854339
موبائل نمبر: 9939952649
abdulhakeem9506559@gmail.com

عزیر احمد نورالہدیٰ
پتہ: ہنواٹاری، نئی کوٹ، مہراج گنج، نوتنواں
پن نمبر: 273164
موبائل نمبر: 9670223959
uzairnajm@gmail.com

شفیق احمد جمیل احمد
پتہ: اونرہواں، دھنوائی، بچپڑوا، تلسی پور،
بلرامپور، پن نمبر: 271215
موبائل نمبر: 8601154957
shafeequeahmad788@gmail.com

عبدالرحمٰن محمد رئیس
پتہ: بیت نار، رموا پور جگت، ترلوک پور،
ڈومریا گنج، سدھارتھ نگر، یوپی
پن نمبر: 272193
موبائل نمبر: 8795703416
abdurrahman120395@gmail.com

مسیح الزماں عبدالوفاء
پتہ: پرسا ضبطی، ہٹوا بازار، ردھولی، بستی، یوپی
پن نمبر: 272125
موبائل نمبر: 00977-9805480484
9936004611
masihuzzamakhan@yahoo.com

منور عالم خان عبدالجلیل خان
پتہ: تنہوا، لمبنیا سنسکرت نگر پالیکا،
وارڈ نمبر: ۸، روپندیہی، نیپال
پن نمبر: 32913
موبائل نمبر: 009779816491933
manauwarkhan68@gmail.com

توفیق احمد طفیل احمد
پتہ: پوکھریا، شیو پتی نگر، موہانہ، نوگڑھ،
سدھارتھ نگر، پن نمبر: 272206
موبائل نمبر: 8601313643
taufeeque.saquib@gmail.com

خبیب ظفر آفاق احمد
پتہ: لڈوامہوا، (امرڈوبھا) بکھرا، سنت کبیر نگر، یوپی
پن نمبر: 272199
موبائل نمبر: 9169037792
9670481716
aaman6393@gmail.com

توحید عالم امداد الحق پتہ: کولہا، گا چھپاڑا، کشن گنج، بہار پن نمبر: 855107 موبائل نمبر 8115085342 9801430164 tauheedalam435@gmail.com	**ظہیر الاسلام جلال الدین** پتہ: ہاتی چھپاپا، دولت نگر، ہریش چندر پور، مالدہ، مغربی بنگال، پن نمبر: 732125 موبائل نمبر: 8543867199 9775281252 zahirulislamsalafi@gmail.com
محمد عبداللہ اظہر علی میاں پتہ: اسلام پورا سماعیل چوک سلفی ٹولہ، اسلام پور، اتر دیناج پور، مغربی بنگال، پن نمبر 733202 موبائل نمبر 8159941944 7071545677 abdullahsalafi11@gmail.com	**محمد آزاد علی ممتاز عالم** پتہ: ڈانگی باڑی، ٹھاکر گنج، کشن گنج، بہار پن نمبر: 855116 موبائل نمبر: 8757693107 azadsalafi123@gmail.com
محمد مسعود عالم حضرت علی پتہ: ٹیونسہ، کشن گنج، بہار، پن نمبر: 855107 موبائل نمبر: 7631640832 9709149167 maswoodalamsalafi@gmail.com	**عبیداللہ عبدالقدوس** پتہ: بھگوان پور، بلبھدر پور، سپول، بہار پن نمبر: 854339 موبائل نمبر: 9546015730 8960378054 obaidullah709@gmail.com
شہاب الدین عبدالرزاق پتہ: خیرو گنج، بنگواں، اررریہ، بہار پن نمبر: 854312 موبائل نمبر: 9801866862 shahabuddinsalafi41@gmail.com	**انار الحق محمد شفاء الرحمٰن** پتہ: جمرہ رتن پور، بیریا، امداباد، کٹیہار، بہار پن نمبر: 854112 موبائل نمبر: 8002429187

طارق اسعد اسعد اعظمی

پتہ: ڈومن پورہ کساری، مئوناتھ بھنجن

پن نمبر: 275101

موبائل نمبر: 7275070177

tariqueasad@ymail.com

عتیق الصمد محمد ابوطاہر

پتہ: بالو پور، رتوا، مالدہ، مغربی بنگال

پن نمبر: 732205

موبائل نمبر: 8574456502

9733344061

atiqussamad33@gmail.com

عبدالرحمن محمد مبارک

پتہ: اٹوا، سدھارتھ نگر

پن نمبر: 272192

موبائل نمبر: 9169045965

arahmanitwa@gmail.com

محمد نثار محمد یاسین

پتہ: چوری بازار، جھگواں کلاں، جلال پور،

جون پور، یوپی، پن نمبر: 222146

موبائل نمبر: 9169965859

mohdnisar974@gmail.com

شکیل احمد نجرلیس احمد

پتہ: گھمائچ مئو، جلال پور پنوارہ، قنوج

پن نمبر: 209727

موبائل نمبر: 9198672388

9198203874

shakeelahmadsalafi@gmail.com

محمد عاصم افضال احمد

پتہ: ہٹھی مداری، مئوناتھ بھنجن

پن نمبر: 275101

موبائل نمبر: 8400713287

8090763634

asimafzal3634@yahoo.com

اخلاق احمد محمد یوسف

پتہ: چوری بازار، جھگواں کلاں، جلال پور،

جونپور، یوپی، پن نمبر: 222146

موبائل نمبر: 9044558589

8009017540

akhlaquesalafi@gmail.com

ریاض احمد وکیل احمد

پتہ: بی ۱۹/۶۹۔ اے، ڈیوڑیا بیر، بھیلوپورہ،

بنارس

موبائل نمبر: 7071644038

ahmadreyar006@gmail.com

رفیع الہلال محمد سفیان پتہ: عبداللہ پور، آکولی، برہروا، صاحب گنج، جھارکھنڈ، پن نمبر:816101 موبائل نمبر:7309136148 8651341802 rafiulhelal83@gmail.com	حامد اقبال اقبال احمد پتہ: کھیدو پورہ، مئوناتھ بھنجن پن نمبر:275101 موبائل نمبر:9651444460 mdslfi1@gmail.com
عبداللہ عین الحق پتہ: بنگروره (ڈنگروگھاٹ) چڑیا، بائسی، پورنیہ، بہار، پن نمبر:854315 موبائل نمبر:9851465059 9473465214 abdullahainulhaquesalafi@gmail.com	ابووقاص خورشید احمد پتہ: املو، مبارک پور، اعظم گڑھ پن نمبر:276401 موبائل نمبر:9125047455 abuwaqqas4039@gmail.com
عبدالرحمن محمد شمیم پتہ: املو، مبارک پور، اعظم گڑھ پن نمبر:276401 موبائل نمبر:9044807898 abdurrahmanazmi310@gmail.com	محمد رفیق انصاری معین الدین انصاری پتہ: جے ۱۴/۱۲۳/۱۲۔ پی A1، قاضی سعداللہ پورہ، بڑی بازار، بنارس موبائل نمبر:9696081313
ثناءاللہ محمد الیاس پتہ: دوست پور، سلطان پور، یوپی پن نمبر:228131	عمیر کمال کمال الدین آثمی پتہ: مہتوانہ، مئو آئمہ، سوراوں، الہ آباد پن نمبر:212507 موبائل نمبر:7052989258 7784818370 umair Kamal13@gmail.com

محمد محمود الحق محمد حمید الحق

پتہ: تارانگر، اعلامی، پاکوڑ (مفصل) جھارکھنڈ

پن نمبر:816107

موبائل نمبر:8298844658

mahmud3725@gmail.com

صابر الاسلام امان اللہ

پتہ: چنڈی تلہ، جھیکر ہاٹی، پاکوڑ جھارکھنڈ

پن نمبر:816107

موبائل نمبر 8001752317

خمسین برائے خواتین

خواتین سے متعلق پچاس احادیث

شیخ اسعد اعظمی
استاذ جامعہ سلفیہ، بنارس

Page: 88

اربعین فی تربیۃ البنات والبنین

بچوں کی تربیت سے متعلق چالیس احادیث

ترتیب، ترجمہ وتشریح

شیخ اسعد اعظمی
استاذ جامعہ سلفیہ بنارس

Page: 80

تاریخ وتعارف

مدرسہ دار الحدیث رحمانیہ دہلی

ترتیب

شیخ اسعد اعظمی

استاذ جامعہ سلفیہ بنارس

تقدیم

شیخ صلاح الدین مقبول احمد حفظہ اللہ

تاثرات

شیخ محمد اعظمی حفظہ اللہ

Page: 280

تعزیہ داری

علمائے امت کی نظر میں

جمع وترتیب

مولانا حافظ اسعد اعظمی

استاذ جامعہ سلفیہ بنارس

Page: 80





ملنے کے پتے:

مکتبۃ الفہیم ریحان مارکیٹ، ڈھوبیا املی روڈ، صدر چوک مئوناتھ بھنجن

مکتبہ سلفیہ جامعہ سلفیہ، ریوڑی تالاب، وارانسی

₹ 70/-